طبی تقدمے

سید ظل الرحمٰن

طبی تقدمے

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن

شعبہ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۰ء

تعداد : ۵۰۰
طباعت : مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ
قیمت : سو روپیہ
پتہ : پبلی کیشن ڈویژن
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

انتساب

استاد محترم شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی مرحوم

کی نذر

عقیدت واحترام کے ساتھ

فہرست

تعارف ۷

کلیات

تقدمہ تجدید طب ۱۳

تقدمہ کتاب المرشد ۲۰

تقدمہ مبادیات طب ۲۵

تقدمہ الکلیات الامور الطبعیہ ۲۷

تقدمہ حفظان صحت اور حمام ۳۰

تشریح

تقدمہ تشریح البدن حصہ اوّل ۴۲

تقدمہ تشریح البدن حصہ دوم ۴۴

علم الادویہ

تقدمہ قوانین ادویہ ۴۸

تقدمہ کنزالادویہ ۵۲

تقدمہ گوسوامی بیان الادویہ ۵۹

تقدمہ مفردات طب ۶۱

تقدمہ منہاج الصیدلہ ۶۸

تقدمہ کتاب الصیدلہ والمرکبات ۷۵

تقدمہ یونانی فارماکوپیا ۷۸

تقدمہ بیاض خاص ۸۰

تشخیص و معالجات

تقدمہ اصول نسخہ نویسی ۸۴

صفحہ

تقدمہ رہنمائے تشخیص ۸۷
تقدمہ تشخیص اسباب و علامات ۹۱
تقدمہ جدید اسباب الامراض اور معالجات ۹۳
تقدمہ ذخیرہ ثابت بن قرۃ ۹۵
تقدمہ بخاروں کا علاج حصہ اوّل ۱۱۱
تقدمہ علاج امراض جلد، دوم
تقدمہ اوراق پارینہ (نسخہ ہائے ذیابیطس) ۱۱۵
تقدمہ مجربات تکمیلی ۱۱۸

تاریخ طب

تقدمہ تاریخ طب ۱۱۹
تقدمہ تاریخ طب واخلاقیات ۱۲۹
تقدمہ بیت الحکمت کی طبی خدمات ۱۳۳
تقدمہ علوم و ثقافت اسلامیہ ۱۴۲
تقدمہ سرجری اسلام کے قرون اولیٰ میں ۱۴۷

لغت

تقدمہ طبی لغت ۱۵۳
تقدمہ مختصر طبی لغت ۱۵۸

متفرقات

تقدمہ رسائل مسیح الملک ۱۶۴
تقدمہ اختیارات قاسمی ۱۷۲
تقدمہ طب یونانی اور چیلنجز ۱۷۵
تقدمہ مفاتیح الغیب ۱۷۸
حواشی ۱۹۷

تعارف

عجائبات عالم میں کچھ تو مادی مظاہر ہیں جنہیں بہ چشم سر دیکھا جا سکتا ہے، کچھ وہ ہیں جن کے اسرار و رموز سمجھنے کیلئے علم ہی نہیں تجربہ و مشاہدہ بھی شرط ہے۔ ان میں سے ایک اعجوبہ یہ بھی ہے کہ طلوع اسلام کو ابھی نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں نہایت تیزی سے پیش رفت ہونے لگی۔ مذہبی علوم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرۃ اور مغازی وغیرہ کے علاوہ جن علوم میں مسلمانوں نے خصوصی دلچسپی لی اور ان میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافے کئے، اُن میں فن طب بھی شامل ہے۔ چونکہ اس کی فلسفیانہ اساس یونانی حکماء کی تصانیف پر رکھی گئی تھی اس لئے آج بھی طبیب کو "حکیم" کہا جاتا ہے۔ اب اسے مسلمانوں کی علمی رواداری یا دیانت ہی کہیں گے کہ انہوں نے یونانی حکماء سے طب کے ابتدائی رشتے کو فراموش نہیں کیا اور اسے طب یونانی ہی کہتے رہے، حالانکہ وہ اپنی ترقی یافتہ شکل کے بعد بجا طور پر "طب العرب" کہے جانے کا حق رکھتی تھی۔ مگر اب حیرت یا افسوس اس پر ہے کہ طب یونانی نہ یونان میں رہی، نہ یوروپ میں، نہ ممالک عربیہ میں۔ آج تک یوروپ اور بعض عرب ممالک میں بھی اس کا رواج ممنوع ہے۔ حالانکہ ایلوپیتھی میں طب و جراحت کی بنیاد بھی حنین بن اسحٰق، ثابت بن قرۃ، محمد بن زکریا رازی، شیخ الرئیس بو علی سینا، ابن نفیس، داؤد انطاکی اور ابوالقاسم زہراوی جیسے عبقری طبیبوں اور علم تشریح کے ماہروں نے فراہم کی ہے۔

طلوع اسلام کے بعد علم طب میں بحث و تحقیق کا بیشتر کام مسلم علماء نے کیا ہے اور ان کی کتابیں عربی یا فارسی زبانوں کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ اس فن کو ابتدا میں عباسی دربار خلافت سے جو سرپرستی ملی اس سے بہت پیش رفت بھی ہوئی لیکن بعد کی صدیوں میں اس سے نقصان بھی ہوا کہ صرف ظل الٰہی کے مزاج ہمایونی کی نگہداشت

یونانی اطباء کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ دوسرا نقصان مذہبی علماء کی غلط اندیشی سے ہوا کہ انہوں نے مذہب، اخلاقیات اور مسائل طبیہ مثلاً تشریح البدن کے رشتوں کو خالص اخلاقی اور مذہبی زاویے سے دیکھا حالانکہ یہ قطعاً غیر ضروری اور غیر متعلق تھا۔ اس طرح فن جراحت کو بہت نقصان ہوا اور وہ علم طب کے ساتھ ساتھ قدم نہیں بڑھا سکا، سست رفتار ہو گیا اور جراحوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آگیا۔ بعد کے زمانے میں ایلوپیتھی نے فن جراحت کو ترقی دی حالانکہ موجودہ سرجری کی بنیاد بھی طب العرب کے مسلم حکماء کی رکھی ہوئی ہے اور آج بھی آپریشن میں استعمال ہونے والے بعض آلات وہ ہیں جن کی ابتدائی شکل قدیم اطباء کی کتابوں میں مل جاتی ہے۔

اس کے باوجود عہد وسطیٰ میں خصوصاً عہد مغلیہ کے ہندوستان میں نامور اطباء پیدا ہوتے رہے جن کے علمی اور تحقیقی کارنامے آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد روز مائل بہ زوال ہے۔ سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد طب کی پیش رفت بھی رک گئی تھی اور روایتی طبیبوں کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے پیش رو حضرات کی بیاضوں اور قرابادینوں سے نسخے تلاش کریں اور انہیں اپنے کسب معاش کا ذریعہ بنائیں خود ان میں ایجاد و اجتہاد کی صلاحیت نہ رہی تھی، علمی اور تحقیقی جذبہ سرد پڑ گیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس فن شریف کی بقا اور تحفظ کیلئے دہلی کے خاندان شریفی حکیم محمود خان مرحوم اور مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم، نیز خاندان عزیزی لکھنؤ میں حکیم عبدالعزیز، حکیم عبدالحمید اور حکیم عبداللطیف فلسفی جیسے علماء پیدا کر دیئے جنہوں نے فن طب کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا اور اس فن شریف کا چلن ختم نہیں ہونے دیا جو مسلمانوں کی علمی میراث اور ان کی ثقافت کا ایسا مظہر تھا جس کو عام انسانوں کی خدمت کے لئے مسلمانوں کی کوشش کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اور ان حضرات کے معاً بعد آنے والی نسل میں، حکیم عبدالحمید دہلوی مرحوم اور اُن کے بھائی حکیم محمد سعید شہیدؒ نے عملی طب کو

مقبول عام بنانے میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔ نظری سطح پر طب یونانی میں بحث و تحقیق کے دروازے بھی کھلے اور اس میدان میں جن اطباء نے نہایت بیش قیمت علمی خدمات انجام دیں ان میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن کا نام سب سے نمایاں ہے۔

پروفیسر سید ظل الرحمٰن عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ایک نہایت قدیم علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں علوم اسلامیہ اور فن طب دونوں کی بڑی مستحکم روایت عہد سلطنت سے رہی ہے۔ اگر کوئی فن خاندانی ورثہ کے طور پر ملا ہو تو اُس میں بڑی برکت ہوتی ہے، ذاتی کوشش و کاوش سے اس میں اضافہ کیا جائے تو وہ اس روایت کو اور بھی نہ صرف شاندار بلکہ جاندار اور پائیدار بنادیتا ہے۔ اس زمانے میں یونانی طب کے بہت سے کالج کھلے ہوئے ہیں ان سے علم طب کی سندیں لے کر نکلنے والے بھی کچھ کم نہیں، مگر اس کا ایک پہلو ایسا ہے جسے دیکھ کر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوتی کہ علم طب کے اکثر سندیافتہ خود کو حکیم کے بجائے ڈاکٹر کہنا اور کہلوانا پسند کرتے ہیں اور بیشتر علاج بھی ایلوپیتھی کی پیٹنٹ دواؤں سے کرنے لگے ہیں۔ مفردات سے علاج کرنے والے طبیب معدودے چند ہیں، وہ بھی کہیں دیہات وقصبات ہی میں مل سکتے ہیں۔ حکیم سید ظل الرحمٰن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ طب یونانی میں "شرک" کے مرتکب نہیں ہوئے اطباء سلف کے معیاروں سے ہی فن کی عملی اور نظری خدمت کرتے رہے ہیں۔ اُن کا یہ رویہ کسی عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ طب یونانی میں تمام علمی اور فنی مسائل کا حل موجود ہے اور انہیں اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کی روشنی میں بھی جانچا پرکھا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل تعریف ہے کہ وہ طب یونانی کو جامد فن نہیں مانتے، اس کی جدلیاتی اور حرکی قوت کے قائل بھی ہیں اور موئید بھی۔ انہوں نے "دور جدید اور طب" کے موضوع پر جن خیالات کی تبلیغ اور اشاعت کی ہے وہ ان کے آزاد خیال اور ترقی پسند مفکر ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمٰن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی مصادر سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں، انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہونے سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے سند فراغت حاصل کی تھی۔ آج بہت ہی کم طبیب ایسے ہیں جو عربی فارسی مصادر سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ انہیں قدیم مخطوطات کا بھی ذوق ہے اور وہ علوم مشرقیہ کی بیشتر بڑی لائبریریوں میں محفوظ طبی مخطوطات کا جائزہ لیتے رہے ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے خود بھی اپنے ذاتی ذخیرے میں چار سو کے قریب نادر قلمی نسخے جمع کر رکھے ہیں اور اپنے گھر کو ایک چھوٹا سا میوزیم بنالیا ہے جسے اب اپنے ذاتی سرمائے سے ایک ریسرچ سینٹر میں تبدیل کر رہے ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمٰن میرے بہت ہی عزیز دوست ہیں۔ وہ اپنے اخلاق اور کردار میں بھی ایک مثالی شخصیت ہیں۔ اُن سے میرا تعارف اس زمانہ میں ہوا جب وہ طبیہ کالج گلی قاسم جان دہلی میں لیکچرر ہوئے اور چھ سات سال تک دہلی میں مقیم رہے، اُس زمانہ میں ان سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی، اسی زمانہ میں انہوں نے بڑے شوق اور انہماک سے ایک طبی رسالہ "الحکمت" جاری کیا تھا جو چھ سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا اور طبی حلقوں میں بہت معیاری اور معتبر تحقیقی رسالہ سمجھا جاتا تھا۔

انہوں نے سخت محنت اور دیدہ ریزی سے علمی دنیا میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ ان کی تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ہر کتاب اپنے موضوع پر قابل استناد ماخذ مانی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے متفرق تحقیقی مضامین کی تعداد بھی ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔ انہوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر کے فن طب کی نمائندگی کی ہے اور اطبائے سلف کی فنی خدمات سے دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بیرونی ممالک میں جاکر بھی ہندوستان میں فن طب کی ترویج و ترقی کا تعارف کرانے اور اس فن کا اعتبار بڑھانے کے مواقع ملے ہیں۔ وہ ہندوستان کے پہلے طبیب ہیں جنہیں کلاسیکی زبانوں میں علمی شغف کا سب سے

بڑا قومی اعزاز یعنی صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے ''سند امتیاز'' لائف پنشن کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اُن کا ایک امتیاز ہے کہ انہوں نے ۳۵ سے زیادہ کتابوں پر عالمانہ مقدمے لکھے ہیں جنہیں اب یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ یہ مقدمے خود متنوع موضوعات پر ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ پروفیسر موصوف نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بعض مضامین جو نسبتاً تفصیل سے لکھے گئے ہیں وہ حکیم ظل الرحمٰن کے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے علاوہ اس کی شہادت بھی دیتے ہیں کہ انہوں نے فن طب کے مختلف علمی اور اصطلاحی پہلوؤں کا کتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان موضوعات پر علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو کس طرح کھلے دل سے سراہا ہے۔

فن طب کے سوا اسلامیات اور ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ پر بھی وہ شناسانہ نظر رکھتے ہیں۔ تاریخ طب و تشریح اور علم الادویہ کے میدان میں تو شاید ہی اس برصغیر میں کوئی ان کا مدمقابل ہونے کی جرأت کر سکے۔ زیر نظر کتاب میں جو مقدمے حمام، ثابت بن قرۃ، تاریخ طب اور سوانح حکیم سید کرم حسینؒ پر لکھے گئے ہیں وہ کوئی سرسری تحریر نہیں بلکہ خود فکر و نظر اور بحث و تحقیق کا بہترین نمونہ ہیں۔

یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خوش نصیبی تھی کہ اسے حکیم عبداللطیف فلسفی مرحوم جیسے حاذق طبیب کی خدمات حاصل رہیں اور یہ فلسفی مرحوم کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں حکیم سید ظل الرحمٰن جیسا سعادت مند اور سچا علمی ذوق رکھنے والا شاگرد ملا، جس نے خاندان عزیزی کی فنی خدمات کو بھی زندہ کر دیا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی قوم قبیلے یا خاندان میں ایک ہی شخص ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کی حیثیت شمع محفل کی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک شمع کی لو ظلمت کا نقاب چیر کر ہمیں سب حاضرین کے چہرے دکھا دیتی ہے اسی طرح کسی فنی یا روحانی سلسلے یا علمی خانوادے کی ایک ہی شخصیت کے وسیلے سے پورے سلسلے یا خانوادے کا تعارف ہو جاتا ہے اور اس کی ماضی کی خدمات بھی روشنی میں آجاتی ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمٰن کی علمی خدمات سے ان کے اپنے خانوادے کی قابل رشک تاریخ بھی روشنی میں آئی اور ہندوستان میں کئی صدیوں تک اطباء نے جو نظری اور علمی خدمات انجام دی تھیں ان پر غور و فکر کے دروازے بھی کھلے۔ اب کہ اُن کے حسن خدمت پر وظیفہ یاب ہونے کا زمانہ قریب سے قریب تر آرہا ہے، ہمیں یہ امید ہی نہیں یقین ہے کہ ان کی علمی خدمات کی نہ صرف رفتار بلکہ معیار و مقدار میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسلئے ہم ان کی صحت اور سلامتی کی دل سے دعا کرتے ہیں۔حفظه الله وأبقاه واوصله الى أسنى الاهداف العلمية۔

نثار احمد فاروقی

شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی
دہلی۔۷

۱۵ر جولائی دو ہزار

تقدمہ تجدید طب

انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں طب مذہب کے زیر اثر تھی۔ مذہبی رہنما اس کے وارث اور علمبردار قرار دیئے گئے تھے اور ہر طبی مسئلہ کا حل مخصوص مذہبی عقیدہ کی روشنی میں تلاش کیا جاتا تھا۔

مصر و بابل کے اس بعید ترین عہد کے بعد یونان کا دور زرین شروع ہونے پر جب طب کو مذہب کی گرفت سے آزادی ملی اور ایک علم کے طور پر اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں تو یونانیوں کے مخصوص تفکیری ذہن سے اس کا بچنا مشکل ہو گیا۔ یونان میں فلسفہ کی گرم بازاری تھی۔ تمام علمی مسائل کے لئے فلسفیانہ موشگافیوں کا سہارا ضروری سمجھا گیا۔ مذہبی تصورات تک اسی رنگ میں رنگے گئے اور مذہب کے لئے ایک قدم بھی اس کے بغیر بڑھانا مشکل ہوا۔

رہنمایان مذہب کی اجارہ داری کی طرح یہاں طب اور دوسرے علوم و فنون فلاسفہ کے زیر نگین تھے اور ہر مسئلہ کو مذہبی عینک کے بجائے فلسفہ کی میزان پر تولا جاتا تھا۔ چونکہ کوئی بھی مسئلہ فلسفہ کی تائید اور سند کے بغیر علمی مرتبہ اور قبولیت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اسلئے طب کی تعمیر بھی فلسفہ کی بنیادوں پر کی گئی اور تمام طبی نظریات کا فلسفیانہ مباحث کی روشنی میں مطالعہ شروع کیا گیا۔

گزشتہ ادوار میں طب کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا کم و بیش اسی صورت حال سے اسے گزشتہ صدی میں بھی دوچار ہونا پڑا اور طب مذہب اور فلسفہ کے دائرہ سے نکل کر سائنس کی آغوش میں چلی گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ طب نہ محض فلسفہ کی چیز ہے اور نہ تمام تر اسے سائنس کے حوالہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ موجودہ دور میں کلی طور پر وہ ایک

مطبوعہ طبی اکادمی علی گڑھ، ۱۹۷۲ء

خالص سائنسی اور معملی فن بن کر رہ گیا ہے اور دوسری مادی اور مشینی اشیاء کی طرح اس کے مطالعہ کی کوشش کی جارہی ہے۔ فلسفہ کے غیر ضروری احاطہ کی طرح سائنس کا حد سے بڑھا ہوا اثر طب کی حقیقی ترقی میں مانع ہوا اور انسانی بدن اور اس میں رونما ہونے والے غیر طبعی اور مرضی تغیرات کے سلسلہ میں آج تک خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہو سکی۔

طب اور سائنس کے موجودہ رشتہ کی طرح طب اور فلسفہ کے درمیان جو گہرا حد سے ضروری تعلق قائم ہوا اس سے بے اعتنائی برت کر یونانی طب کو اس کی اصلی شکل میں نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ طب کے بنیادی مسائل میں فلسفیانہ مباحث بطور اصل شامل ہیں اور بیشتر نظریات اس سے استنباط کئے گئے ہیں۔ اسی لئے طب کی تعلیم سے پہلے جن علوم کی معلومات ضروری قرار دی گئیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت فلسفہ کو حاصل ہوئی۔ کیفیات، عناصر، مزاج، اخلاط اور دوسرے مباحث فنیہ میں اسکی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک طبی نصاب کے لئے جو بنیادی قابلیت مقرر کی گئی تھی اس میں ان علوم سے واقفیت کی شرط تھی جن کا شمار مبادیات طب میں کیا گیا ہے اس لئے طبیب اپنے فن میں کامل اور اس کے مزاج و فلسفہ سے پوری طرح آشنا ہوتے تھے۔ بعد میں جدید علوم کی نقل میں طب کے لئے شرائط داخلہ کے طور پر جو بنیادی قابلیت مقرر کی گئی اس میں فلسفہ نے سب سے کم اہمیت پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طب کو سمجھنا مشکل ہو گیا اور بنیادی علوم کو نہ جاننے کی وجہ سے مبادیات و نظریات طب معمہ اور چیستان بن کر رہ گئے۔

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب اطباء کی اس صف سے تعلق رکھتے تھے جسے طب کے علوم مبادیہ پر گہرا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے قدیم فلسفہ کی بہت باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے شہرۂ آفاق طبی خانوادہ کے وہ پہلے فرد تھے جس نے بغرض حصول علم لکھنؤ سے باہر کا سفر اختیار کیا اور رام پور پہنچ کر فلسفہ کے یگانہ عصر استاد

مولانا فضل حق رام پوری سے جن کا سلسلہ ایک واسطہ سے امام الہند مولانا فضل حق خیر آبادی سے ملتا ہے، معقولات کی تحصیل کی۔ شاگرد کے ذوق اور شوق بے پایاں نے استاد کی توجہ کو پورے دوران تعلیم اپنی طرف منعطف رکھا اور ان کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار رہا۔ یہ فلسفہ ان کے ذہن و دماغ میں کچھ اس طرح سرایت ہوا کہ مزاج میں ڈھل کر طبیعت ثانیہ بن گیا۔ وہ شروع ہی سے فلسفی کہلائے، تحریر و تقریر، غور و فکر اور علمی و فنی مسائل کے استنباط سے لے کر عام گفتگو تک میں اس کے اثرات طاری رہتے تھے۔

علم طب کے مبادیات پر جن تک بغیر فلسفہ رسائی نہیں ہو سکتی تھی ان کی نظر غیر معمولی تھی۔ بصیرت و عرفان فن اور مسائل طبیہ کا صحیح شعور جو انہیں حاصل تھا، موجودہ صدی میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ وہ آخری فلسفی طبیب تھے۔ معاصر اطباء میں اس امتیاز نے ان میں یکتائی اور انفرادیت کی عجیب شان پیدا کر دی تھی۔

انہوں نے طب کے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے۔ تاریخ، علم الادویہ، نبض، بول، براز، علم الولادت، معالجات، تشخیص، تجویز، نصاب، ریسرچ جیسے مختلف النوع مضامین ان کے زیر قلم رہے ہیں۔ بعض موضوعات پر انکی مستقل تصانیف اور رسالے ہیں لیکن جس مضمون پر انہیں سب سے زیادہ لکھنے کا حق تھا وہ کلیات ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے مضامین کا آغاز ۱۹۱۹ء سے ہو گیا تھا اور علم الادویہ کے بعض کلیاتی مباحث رسالہ خادم الاطباء میں ان کے زیر قلم آ چکے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں جب رام پور میں آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو کانفرنس کی دعوت پر "عناصر" کے عنوان سے انہوں نے ایک مقالہ پیش کیا۔ اس خالص تحقیقی و تنقیدی مقالہ میں ان کا مخصوص رنگ بے حد نمایاں ہے۔ ملک کے ممتاز اطباء کے اس اجتماع میں پڑھے گئے اس مضمون کا کانفرنس کی روئداد میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

"جناب حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی کا یہ مضمون نہایت غور و خوض اور پوری دلچسپی کے ساتھ سنا گیا اور جب مضمون ختم ہوا تو حاضرین نے پرزور چیرز سے حکیم صاحب

موصوف کی کاوش و تحقیق کی داد دی۔"[1]

۱۹۲۷ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کے قیام کا طے پایا تو مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر نواب سر مزمل اللہ خاں کو شفاء الملک مرحوم کے متعلق جو خط تحریر فرمایا اس میں اس مضمون کا خاص طور پر تذکرہ کیا تھا۔ "انہوں نے گزشتہ طبی کانفرنس میں جو رام پور میں منعقد ہوئی تھی۔ عناصر پر ایک طویل مضمون نہایت قابلیت کے ساتھ لکھا تھا جس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ تنگ دل طبیب نہیں ہیں بلکہ صحیح مسائل پر وسعت نظر کے ساتھ رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ مضمون تمام اطباء نے پسند کیا تھا اور میں نے تو اس مضمون کو ان تمام مضامین پر ترجیح دی تھی جو کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔"[2]

اپریل ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ سے طبیہ کالج میگزین کا اجراء عمل میں آیا۔ اسکے پہلے شمارہ میں کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ مرحوم کا یہ مضمون شائع ہوا اور اب نہ صرف طبی حلقوں میں بلکہ یونیورسٹی اور ملک کے علمی و سائنسی حلقوں میں اس مضمون کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ چنانچہ کرنل حیدر خاں پروفیسر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا ایک مضمون طبیہ کالج میگزین کے اگلے ہی شمارہ میں شائع ہوا ان کا یہ مضمون تنقیدی تھا اور انہوں نے قدیم و جدید کی مطابقت کے سلسلہ میں حکیم صاحب کی بعض کوششوں سے اختلاف کیا تھا لیکن انہوں نے حکیم صاحب کے اس اقدام کی جو اس وقت طبی حلقوں کی جانب سے ایک نیا اور غیر معمولی واقعہ تھا تعریف کرتے ہوئے لکھا "مضمون تجدید طب (عناصر) میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ حکیم صاحب موصوف کے مضمون سے فلسفہ قدیم کے متعلق میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ اس بات سے بڑی خوشی ہے کہ اطباء اب جدید علم کی طرف توجہ کرتے جاتے ہیں اور پرانی معلومات کو نئی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ حکیم صاحب کی اس جدت سے فن طب میں ایک نئی روح پیدا ہو جائے گی اور اب تک جو خیال تھا کہ اطباء صرف پرانے نسخوں کی تلاش میں رہتے ہیں غلط ثابت ہوگا۔"[3]

طب کے اس بنیادی موضوع پر قلم اٹھانے کے بعد ان میں مزاج اور اخلاط پر لکھنے کا بھی داعیہ پیدا ہوا اور تجدید طب کے عنوان سے ان دو اہم موضوعات پر انہوں نے طبیہ کالج میگزین میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ مضامین اپریل ۱۹۳۳ء سے اپریل ۱۹۳۵ء تک مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے۔ ان دونوں موضوعات پر بھی انہوں نے جو مواد اور تفصیلات پیش کی ہیں انہیں ان کی آئندہ تحقیق کیلئے بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

ان مسائل کی حیثیت دراصل خالص طبی نہیں ہے اور نہ طبی کتابیں اور اطباء بحیثیت طبیب اس کے متکفل ہیں۔ یہ دراصل حکمت طبعیہ کے معرکۃ الآراء مسائل ہیں جو اصول موضوعہ کی حیثیت سے طب کی کتابوں میں شامل کئے گئے ہیں۔ چنانچہ رئیس الصناعہ نے قانون میں عناصر کے متعلق لکھا ہے "**فلیتسلم الطبیب من الطبعی انها اربعة**" طبیب کو حکمت طبعی سے تسلیم کرلینا چاہئے کہ ارکان چار ہیں۔"

حکمت طبعی کا یہ مسئلہ جس قدر مورد اختلاف بنا، دوسرے مسائل کے سلسلے میں شاید ہی اسکی مثال مل سکے۔ اس باب میں جو اختلافات و مذاہب ہیں ان سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ استاد مرحوم کے بقول اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں "تخلیق عالم" کا حل مضمر ہے جس طرف ہر شخص فطرتاً متوجہ ہوا اور جس کی تحقیق میں زبردست دماغی قوتیں متحرک اور مشغول رہیں۔

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب چونکہ طبیب محض نہیں تھے۔ حکمت طبعی کے بھی زبردست فاضل تھے۔ اس لئے ان موضوعات پر ان کی تحریریں موجودہ عہد کے اطباء کے لئے سرمہ بصیرت ہیں۔ حکمت طبعی اور طبی علوم کی جو گراں قدر معلومات ان کو حاصل تھیں ان کی روشنی ان صفحات میں بکھری ہوئی ہے۔

مزید برآں عناصر پر اس انداز سے قدیم و جدید دونوں علوم کی روشنی میں کبھی بحث نہیں کی گئی تھی۔ یہ مضمون جہاں قدیم فلسفہ پر ان کی وسعت نظر کا آئینہ دار ہے

وہاں جدید معلومات سے واقفیت کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ ان مباحث کے سلسلہ میں تبحر علم اور ژرف نگاہی کا ہی اظہار نہیں ہوتا ہے، تجدیدی رجحانات اور تحقیقی صلاحیتیں بھی پوری طرح نمایاں ہوتی ہیں۔ جگہ جگہ وہ متقدمین سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ان کے بعض دلائل کی تردید اور بعض دلائل کی تائید ہی نہیں کرتے بلکہ مختلف آراء کے درمیان محاکمہ کر کے استدلال اور وزن کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق بھی پیش کرتے ہیں۔

دراصل انہیں فاضل خیر آبادی کا یہ قول یاد تھا "**نحن لسنا ان نومن بما بین دفتی الشفاء**" ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ کتاب الشفاء کی دفتیوں کے درمیان جو کچھ ہے اس پر ایمان لے آئیں۔" رسالہ میر زاہد میں انہوں نے پڑھا تھا "**ان العلوم لاتقف عندحدلاتجاوزة**" علوم کسی ایک متعین حد پر نہیں ٹھہرتے۔ شرح قانون آملی میں فاضل خونجی کا یہ جملہ ان کے مطالعہ سے گزرا تھا۔ "**ان الحد غیر جامع اذا لامورالتی یجب العلم بهایزداد العلم بها یوما فیوما ولم یحط عقل احد بجملة**" حد مقرر نہیں ہے کیونکہ وہ امور جن کے لئے علم ضروری ہے ان کے علم میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے اور کوئی ایک عقل ان سب کا احاطہ نہیں کر سکتی ہے۔" اسی لئے تقریباً ہر مختلف فیہ مسئلہ میں آزادانہ طور پر انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور کہیں بھی محض متقدمین کی پیروی کو کافی نہیں سمجھا ہے۔

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کی وفات (۱۴ نومبر ۱۹۷۰ء) کے بعد انکے علمی کاموں کی تدوین، مضامین کی ترتیب، مجربات و معمولات، سوانح، خاندان عزیزی کی طبی خدمات و تذکرہ پر مشتمل ایک وسیع تالیفی منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں "شفاء الملک میموریل کمیٹی" کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس کے زیر اہتمام اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جاسکے گا۔ اس پہلی پیش کش کے علاوہ ان کی یادگار میں جن کتابوں کی تیاری اور اشاعت شامل ہے۔ اس کا خاکہ درج ذیل ہے۔

۱۔ مضامین شفاء الملک

تقریباً پچاس سال تک انہوں نے جو بلند پایہ علمی و طبی مضامین تحریر کئے ہیں اور جو ملک کے مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں دو جلدوں میں کتابی شکل میں مرتب کیا جائے گا۔

۲۔ مجربات و معمولات شفاء الملک

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ۳۴ سالہ مطب کے معمولات ۱۹۲۷ء سے ۱۹۶۱ء تک مختلف سالوں کے طلبہ کی مطب یومیہ کی کاپیوں کے ذریعہ پورے دور کی نمائندگی کے لحاظ سے مرتب کئے جائیں گے۔ ساتھ ہی وہ مجربات بھی پیش کئے جائیں گے جو خود ان کی اپنی بیاض میں درج ہیں۔

۳۔ سوانح شفاء الملک

ان کی سوانح عمری جس میں ان کے طبی نظریات، اجتہادات اور فنی خدمات کے تعارف کے علاوہ گزشتہ نصف صدی کی طبی، علمی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ اور جد و جہد کی تفصیلات شامل ہوں گی۔

۴۔ تذکرہ خاندان عزیزی

ہندستان کی طبی تاریخ میں خاندان شریفی دہلی کے علاوہ جس خاندان نے سب سے زیادہ فنی منزلت و عظمت حاصل کی ہے وہ لکھنؤ کا عزیزی خاندان ہے، جس کے ایک جلیل القدر فرد شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب تھے۔ لیکن اس نامور خاندان کا کوئی تذکرہ آج تک مرتب نہیں ہو سکا ہے۔ اس کتاب میں اس خاندان کے تقریباً چالیس اطباء کے سوانحی حالات اور طبی خدمات کے ساتھ ان کے مطب کا نمونہ بھی پیش کیا جائے گا۔

۵۔ بیاض وحیدی

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کے والد گرامی حکیم عبدالوحید صاحب کی بیاض جوان کے اور ان کے بزرگوں کے مجربات پر مشتمل ہے۔ اسکے اُردو ترجمہ و تہذیب کا اہتمام کیا جائے گا۔

۶۔ مطب مرتعش

بانی خاندان عزیزی حکیم محمد یعقوب نوراللہ مرقدہٗ کے استاد حکیم میر محمد مرتعش جن سے اس خانوادہ کو خصوصی نسبت تلمذ حاصل ہے، تاریخ طب کی نہایت اہم شخصیت ہیں لیکن ان کی کوئی یادگار ہمارے درمیان نہیں ہے۔ حسن اتفاق سے پچھلے دنوں بھوپال میں ان کا ایک مطب دریافت ہوا اس سلسلے کی ایک یادگار کے طور پر اس مطب کو مرتب کیا جائیگا۔

مضامین شفاء الملک کی ترتیب کے دوران یہ محسوس ہوا کہ تجدید طب کے عنوان سے عناصر، مزاج اور اخلاط پر انہوں نے جس تفصیل سے لکھا ہے وہ خود ایک جدانوعیت کی چیز ہے۔ اس لئے مضامین کے مجموعہ میں شامل کرنے کے بجائے اسی عنوان کے تحت اسکی مستقل حیثیت زیادہ بہتر خیال کی گئی چنانچہ اسے اس سلسلہ کی پہلی پیش کش کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

اس وسیع تالیفی منصوبہ کے سلسلہ میں "شفاء الملک میموریل کمیٹی" کے تمام اراکین کا شکر گزار ہوں۔ پروفیسر حکیم عبدالحسیب صاحب بالخصوص ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے گراں قدر عطیہ سے یہ پہلی پیش کش زیور طبع سے آراستہ ہورہی ہے۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر حکیم حاجی حافظ محمد اسلم صاحب صدیقی کی اس مخلصانہ تڑپ کا ذکر نہ کروں جس کا اظہار اس پورے کام کے دوران ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جلد اس منصوبہ کی تکمیل کا سامان پیدا فرمائے۔

۱۰/ اگست ۱۹۷۲

OO

تقدمہ کتاب المرشد

محمد بن زکریا رازی (۲۵۱۔۳۱۳ھ / ۸۶۵۔۹۲۵ء) کا شمار طب عربی کے طبع زاد مصنفین کی صف اول میں ہے۔ ۷۵۰ء سے ۸۵۰ء تک دورِ ترجمہ کے فوراً بعد جو نامور مصنف اور محقق پیدا ہوئے ان میں علی بن ربن طبری، علی بن عباس مجوسی اہوازی اور ابو سہل مسیحی کے ساتھ محمد بن زکریا رازی بھی ہے۔ ابن سینا سے تقریباً ایک صدی پہلے کے اس مصنف کا مطالعہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس کی تصانیف میں ابن سینا کے ماخذ کی تلاش کی جاسکتی ہے۔ ابن سینا نے اگرچہ اپنی کسی تصنیف میں مراجع کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن جن پیش رو مصنفین نے اس کے طبی افکار پر براہ راست اثر ڈالا ہے اور جن کی کتابیں بطور ماخذ اس کے پیش نظر رہی ہیں ان میں محمد بن زکریا رازی کا نام نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

رازی کی تصانیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے وقت کی طبی معلومات پر مشتمل بہت مواد جمع کیا ہے۔ لیکن اسکے ہاں وہ حسن ترتیب اور طرز نگارش نہیں ہے جو ابن سینا کا امتیاز ہے۔ الحاوی کے سلسلہ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ رازی نے جو یادداشتیں جمع کی تھیں وہ انہیں مرتب نہیں کر سکا اور بعد میں انہیں ترتیب دیا گیا۔ اسی لئے اسے کناش کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری کتابوں میں بھی اسلوب اور تہذیب فن کا نکھار نہیں ہے۔ فلسفیانہ اور منطقی استدلال سے اس کی کتابیں خالی ہیں۔

ابن سینا قدماء فن میں جالینوس کی طرح محمد بن زکریا رازی کو اپنا حریف سمجھتا تھا۔ اس نے ان کا نام لئے بغیر ان پر نقد و جرح کیا ہے۔ رازی ایک خالص معالج تھا۔

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

کلیاتی مباحث اس کا اصل موضوع نہیں تھے۔ معالجات اور مطب کے تعلق سے اس نے جو معلومات پیش کی ہیں وہ طب کے معالجاتی ادب میں بہت خاص سمجھی جاتی ہیں۔

مختلف علمی موضوعات کیمیا، طبیعات، ریاضی، نجوم، منطق، فلسفہ، مافوق الطبیعات، الٰہیات وغیرہ پر رازی کے ابن ندیم (وفات ۹۹۵ء) نے ۱۶۷ ابوریحان البیرونی (۱۰۴۸۔۹۷۴ء) نے ۱۸۴ ابن قفطی (۱۲۴۸۔۱۱۶۷ء) نے ۱۳۷ ابن ابی اصیبعہ (۱۲۶۹۔۱۲۰۳ء) نے ۲۳۸ کتب و رسائل اور مقالات کے نام بیان کئے ہیں۔ ان میں زیادہ کتابیں یعنی تقریباً پانچ درجن طب سے تعلق رکھتی ہیں۔ طبی تصانیف پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تعلق امراض، ادویہ اور دوسرے مضامین فن سے زیادہ ہے۔ کلیات پر صرف دو کتابوں کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کا تعلق بقراط (۴۶۰ قبل مسیح) کی کتاب الفصول سے ہے۔ ایک کتاب الفصول کی تلخیص اور دوسری مرشد جسے فصول کے اغلاق وابہام کو دور کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔

طب کی ابتدائی بنیادی کتابوں میں بقراط کی کتاب الفصول بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اصول طب اور علمی و عملی قوانین مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ جالینوس نے اس کی شرح کی ہے۔ ابن ابی صادق نیشاپوری نے اس شرح کی تلخیص کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ دوسری شروح میں عبداللہ بن عبدالعزیز بن موسیٰ سیواسی کی عمدۃ الفحول فی شرح الفصول (تالیف ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) عبداللطیف بن یوسف بغدادی (وفات ۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء) کی شرح فصول (بغدادی کی شرح پر عزالدین محمد بن ابو بکر بن جماعہ (وفات ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء) نے وسائل الوصول الیٰ مسائل الفصول کے نام سے تعلیق کی ہے) یعقوب بن اسحاق القف الکر کی (وفات ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء) کی ملخص کتاب الاصول فی شرح الفصول (یہ دو جلدوں میں ہے۔ ابن منذر نے اس کی تعلیق کی ہے۔ فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے) شمس الدین محمد بن عبدان دمشقی المعروف بہ ابن اللبودی (وفات ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء) عماد الدین عبدالرحیم، یوسف اسرائیلی مغربی (الملک الظاہر غازی بن ناصر کے زمانہ کا رئیس الاطباء) ابن الطیب،

رضی الدین رحبی (۶۳۱۔۵۳۴ھ/ ۱۲۳۳۔۱۱۳۹ء) احمد بن اسعد بن علوان (بنام تنبیہات العقول علی حل تشکیکات الفصول) صدقۃ السامری دمشقی (وفات ۲۲۰ھ/ ۸۳۵ء) علاءالدین قرشی المعروف بہ ابن نفیس (۱۲۸۸۔۱۲۱۰ء) کی شرحیں ہیں۔ حنین بن اسحاق نے بقراط کی کتاب الفصول کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستان میں کتاب الفصول جان ٹٹلر کے اہتمام اور مولوی سلیمان، غلام مخدوم اور مولوی عبداللہ کی تصحیح سے کلکتہ سے ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ رازی کی کتاب المرشد بھی دراصل بقراط کی کتاب الفصول کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں رازی نے دیباچہ کے مطابق کتاب الفصول کی کمیوں کو دور کیا ہے اور اسے مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلیات طب پر رازی کی یہ اگرچہ ایک مستقل تصنیف ہے، لیکن اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس کی بعض دوسری طبی تصانیف میں کلیاتی مباحث پر خاصا مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اسکی دو بڑی اہم کتابوں میں کتاب الحاوی کی جلد ۶ اسہال، قے، بول، عرق، فصد اور دیگر استفراغات اور اصول و قوانین، جلد ۷ تعریق، قے اور براز، جلد ۱۵ ہواؤں اور مساکن اور امراض واعراض میں ان کی اہمیت، جلد ۱۶ نضج، تعریف، اقسام اور اوقات مرض، جلد ۱۷ نبض کے مفصل بیان، تدبیر النا قہین، جلد ۱۹ بول کے تفصیلی اقسام اور اوقات مرض، جلد ۲۳ کا حصہ اول ماکولات ومشروبات کے قوانین، خواب و بیداری کے منافع و مضرات، تکان، انگڑائی، جمائی، اختلاج وغیرہ کی بحث پر ہے۔ اسی طرح کتاب المنصوری کا مقالہ دوم مکمل طور پر مزاج کی شناخت، مختلف مزاجوں کے دلائل، مزاج معتدل، مزاج اخلاط، مزاج اعضاء، مقالہ سوم پانی اور شراب کے منافع اور غذاؤں کے مزاج وافعال، مقالہ چہارم حرکت بدنی، نیند کے منافع و مضار، تنقیہ بدن، فصد، قے، جماع، حمام کے فوائد و نقصانات، مقالہ ہفتم (جراحیات) فصد، حجامت، علق، مقالہ دہم (حمیات) نضج، استفراغ، نبض، بول، براز کے بیان میں ہے۔ لیکن کلیات پر مرشد کے علاوہ اس کی کوئی جامع تصنیف نہیں ہے۔ اس میں اگرچہ کلیات کے تمام مباحث سے گفتگو نہیں کی گئی ہے اور

نہ اس متعینہ ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے جو بعد کی کلیات کی کتابوں میں ملتی ہے، لیکن اس سے اس عہد تک کی کلیاتی معلومات اور ذخیرۂ علم کا اظہار ہوتا ہے۔ ابن سینا نے کلیات پر جو معرکۃ الآراء کام کیا ہے اور نہایت علمی انداز میں قانون کی پہلی جلد (حصہ کلیات) تصنیف کر کے اس موضوع کو جس طرح سنوارا اور نکھارا ہے اس نے نہ صرف نظریات اور مبادیات طب کو جاندار اور ٹھوس بنیادیں فراہم کیں بلکہ آگے چل کر اسکی روشنی میں اس مضمون کی روایت اور اس کے مطالعہ کو جو فروغ ملا ہے اسکے تقابل سے اسے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

کتاب المرشد تصنیف کے بعد ہی سے اطباء کے درمیان متداول اور معمول بہ رہی۔ نظامی عروضی سمرقندی کے مجوزہ نصاب طب میں کلیات کی کتابوں میں فصول بقراط، مسائل حنین اور شرح نیلی کے ساتھ مرشد کا نام شامل ہے۔ رازی نے جیسا کہ خود بھی دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں فن کے دقیق مسائل بیان کرنے کے بجائے طلبہ کے استفادہ کے لئے عام معلومات پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ کلیات پر ابتدائی درجہ کے کام کے باوجود اس کے ذریعہ نہ صرف ایک بڑے طبی مصنف کی کاوش سامنے آتی ہے بلکہ ایک خالص معالج اور ماہر سریریات کے قلم سے کلیات کے ایسے عنوانات کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی لحاظ سے اصول علاج اور تشخیص و تجویز سے ہے اور جو ایک حد تک معالجات کے دائرہ میں آتے ہیں۔ یہاں کلیات کی فلسفیانہ بحثوں، قیاسی استدلال اور ایسی غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کیا گیا ہے جن کا معالجہ سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کلیات کو معالجات سے قریب بنانے اور کلیات کے جزو عملی پر زیادہ توجہ دینے کی کوشش کے ساتھ اسے معالجات سے رازی کے گہرے تعلق کا آئینہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔

کتاب الفصول ویسمی بالمرشد کا ۱۵۰۰ء کے قریب لاطینی زبان میں وینس (اٹلی) میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ عبرانی میں بھی اس کے ترجمہ کے فرائض انجام دیئے گئے ہیں۔ کتاب خانہ ایاصوفیہ استنبول اور دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود دو خطی نسخوں کی

روشنی میں ڈاکٹر البیرز کی اسکندر نے اسے مدون کیا ہے۔ان کا یہ مدونہ عربی متن مجلہ معہد المخطوطات العربیہ کویت کے مئی ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ حکیم رضی الاسلام ندوی نے مرشد کے اس مطبوعہ نسخہ کو اردو میں منتقل کر کے ایک مفید علمی کام کیا ہے۔ لیکن انکا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مذکورہ دو مخطوطات کے علاوہ اس کا کوئی تیسرا نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ ایران میں اس کے چار نسخوں کی موجودگی کی اطلاع ہے۔ یہ نسخے وہاں کتاب خانہ ملک، کتاب خانہ مجلس، کتاب خانہ آیت اللہ مرعشی قم اور آستانہ قدس مشہد کی امانت ہیں۔ قم اور مشہد کا نسخہ سفر ایران میں راقم السطور کی نظر سے گزرا تھا۔

نوجوان نسل کے جن طبیبوں کی علمی استعداد اور صلاحیت نے مجھے متاثر کیا ہے ان میں رضی الاسلام ندوی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے علمی شغف کا اظہار ان مضامین سے ہوتا ہے جو اب تک ملک کے مقتدر مجلات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے سات عربی رسائل اور مقدمۃ اللغات الطبیہ کے اردو ترجمہ کا شمار ان کے قابل ستائش علمی کاموں میں ہے۔ برصغیر میں قدیم عربی فارسی ذخائر کو اردو میں منتقل کرنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں ان میں کتاب المرشد کا یہ ترجمہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ حکیم رضی الاسلام ندوی اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے اور ان کے ہاتھوں انشاءاللہ مزید علمی خدمات انجام پائیں گی۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۴

○○

تقدمہ مبادیات طب

نظریات و فلسفہ اور اصول وکلیات کے لحاظ سے طب یونانی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کلیاتی مباحث پر ابن سینا سے پہلے بھی طبی کتابوں میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ابن سینا نے قانون جلد اول میں اس موضوع پر جس ژرف نگاہی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور اس میں جو فکر انگیزی پائی جاتی ہے اس نے طب کے اس حصہ کو بہت دقیع اور شاندار بنانے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ علمائے طب کی بہترین صلاحیتیں اس کلیاتی حصہ کی تعبیر و تشریح میں صرف ہوئی ہیں اور طب کے علمی ذخیرہ میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں نہایت قابل قدر ہیں۔

دراصل اس "جزء علمی" کا تعلق عملی اور معالجاتی حصہ سے نہایت گہرا جڑا ہوا ہے اور ان اصول اور کلیات کی روشنی میں عمل اور علاج کی راہیں متعین کی گئی ہیں۔ اسی لئے ان مباحث پر پورے نظام طب کی بنیاد قائم ہے اور یہ اس کے لئے ایک ایسی اساس فراہم کرتے ہیں جو علم طب کی بجا آوری اور اس مخصوص نظام علاج کیلئے جو آج طب یونانی کے نام سے موسوم ہے نہایت ضروری ہیں۔ جز علمی کا یہ رشتہ ماہرین کے یہاں ہمیشہ گہرا اور استوار رہا اور اس کی بدولت ایک مربوط سلسلہ مضامین کے طور پر ان کی اہمیت قائم رہی، جس سے نہ صرف نظریاتی مطالعہ میں بلکہ معالجاتی طور پر پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ ادھر کچھ عرصے سے اس رشتہ کی اہمیت نظر انداز ہو رہی ہے اور طبی نصاب میں ان کلیاتی مباحث کو نظریاتی طور پر کچھ اس طرح پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے کہ ان کی کوئی اطلاقی (Applied) شکل سامنے نہیں آتی ہے اور جز علمی سے عملی استفادہ کی کوئی شکل طالب علم محسوس نہیں کرتا ہے۔ طبی نصاب کی تعلیم کے دوران اس مضمون کے اساتذہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کے ذہن کو اس طرح بنانے کی

. مطبوعہ جے پور ۱۹۸۶

کوشش کریں کہ نہ صرف اس مضمون کی اہمیت نمایاں ہو بلکہ واضح طور پر اس کے افادی اور اطلاقی پہلو بھی ان کے سامنے آئیں۔

نصاب کے تحت "کلیات" کے دوسرے حصوں کی طرح امور طبیعیہ پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ان میں بعض مؤلفین کی اچھی صلاحیت کا اظہار کرتی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کتاب "مبادیات طب" جو سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے نصاب کے مطابق تیار کی گئی ہے علیگڑھ کے ہونہار اور باصلاحیت طبیب حمد اللہ فراہی کی ہے۔

عزیزی حمد اللہ فراہی اعظم گڑھ کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انہیں لکھنے پڑھنے کا ذوق رہا ہے۔ جے پور اور جودھ پور میں اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ انہوں نے اپنا تصنیفی مشغلہ جاری رکھا ہے اس سے قبل "محسوسات و معقولات" کے نام سے ان کا ایک رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

مؤلف کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ انہوں نے موجودہ سائنس اور قدیم نظریات میں مطابقت کے لئے محنت کی ہے۔ امید ہے کہ مبادیات طب (امور طبیعیہ) کی اشاعت سے طلبہ کو اس مضمون کی تفہیم میں مدد ملے گی اور یہ کتاب طبی حلقوں میں سند قبولیت پائے گی۔

۶/ مارچ ۱۹۸۵ء

○○

تقدمہ الکلیات الامور الطبعیہ

جسم انسانی کے مطالعہ میں انسان کا محدود علم اور فکر و فہم نظریات طبی کی اساس ہے۔ ان معلومات و نظریات کے نتائج اور اختلافات مختلف طبوں کا عنوان قرار پائے ہیں۔ طب یونانی میں انسان کے مطالعہ میں "امور طبعیہ" کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ یہ طبیعی امور انسانی وجود کے لئے ناگزیر ہیں۔ نہ صرف تشکیل حیات ان کی منت کش ہے اور صحت کی بقا ان پر انحصار کرتی ہے بلکہ مرض کی پیدائش میں بھی ان کا کلیدی حصہ ہے۔ صحت ان کے توازن واعتدال اور مرض ان کے اختلال اور عدم توازن کو ظاہر کرتا ہے۔ یونانی طب کے ماہرین نے ان امور اور صحت و مرض کے درمیان پائے جانے والے گہرے تعلق کو محسوس کیا اور ان کی بنیاد پر نظریہ وفلسفہ ہی کی عمارت نہیں قائم کی، عملی تدابیر اور علاجی اقدامات بھی تجویز کئے۔ یونانی نظام طب میں ان "امور" کی محوری حیثیت اور اصول وکلیات سے لے کر ادویہ و معالجہ میں ان کی اہمیت کی وجہ سے ہر زمانہ میں اہل فن ان کے مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہے۔ انہوں نے نہ صرف قدیم معلومات کے ذریعہ بلکہ عصری علوم کی روشنی میں وجود انسانی کے ساتھ ان کے رشتے، ہم آہنگی اور تعلق باہم کو سمجھنے کی کوشش کی۔

امور طبعیہ کلیات کا ایک حصہ ہے۔ لیکن بنیادی اہمیت کے سبب دوسرے کلیاتی مباحث کے مقابلہ میں اسے سب سے زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔ اب سے پہلے جب علم نے اس قدر وسعت نہیں اختیار کی تھی، معلومات کا دائرہ تنگ اور محدود تھا، بہت سے علوم ایک دوسرے میں مدغم تھے، طب بھی ایک مضمون کی حیثیت رکھتی تھی۔ طبی

چاپارہ اعظم گڑھ ۱۹۸۶

معلومات کا دائرہ وسیع ہونے پر اس کے مختلف مضامین نے علیحدہ شکل اختیار کی۔ تشریح، منافع الاعضاء، ماہیت الامراض، علم الادویہ، معالجات وغیرہ جدا جدا موضوع قرار پائے۔ ایک ہی کتاب میں ان سب کو یکجا کرنے کے بجائے ان پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

طب کی ابتدائی ترین شکل صرف معالجات تھی۔ نظریات نے بعد میں جگہ پائی اور طب معالجات اور کلیات دو مضامین کا مجموعہ بنی۔ اسکے بعد جب علم کو فروغ ہوا تو جہاں معالجات سے نکل کر امراض عین، امراض اذن، انف، حلق، امراض دنداں، امراض اطفال، امراض نسواں اسی طرح جراحیات اور علم الادویہ نے علیحدہ وجود پایا۔ وہاں تشریح، منافع الاعضاء، ماہیت الامراض، حفظان صحت، نبض، بول و براز، اصول ادویہ، اصول علاج جو کلیات کا موضوع رہے تھے مستقل مضمون کی حیثیت سے ابھرے اور محققین طب نے ان میں سے ہر موضوع پر تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ مہتم بالشان کتابیں تصنیف کیں، لیکن کلیات کے دائرہ سے اگر کوئی مضمون نہیں نکل سکا اور آج بھی جس پر اس کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے وہ امور طبعیہ ہے۔

امور طبعیہ جن کی تعداد سات ہے اور یہ ارکان، مزاج، اخلاط، اعضاء، قویٰ، ارواح اور افعال پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک جہان آباد ہے۔ فلسفیانہ اور طبی حیثیت سے لے کر طبعیاتی، کیمیاوی، حیاتیاتی اور اسی طرح علم النفس کے نقطہ نظر سے اس میں تلاش و تحقیق اور مطالعہ و تفحص کے جو سامان ہیں وہ اہل علم و فن سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ پہلے بھی ان مختلف جہتوں سے ان کا مطالعہ کیا گیا تھا اور آج کے سائنسی دور میں بھی جدید ذرائع علم کی مدد سے ان کی عقدہ کشائی کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان کے حل مطالب سے جہاں اطبائے قدیم کے ذہنی افق، وسیع علمی پس منظر اور نہ صرف بدن بلکہ نفس انسانی کے غائر مطالعہ اور اس کی روح واصل کے عرفان کا پتہ چلے گا۔ وہاں طب اور علاجی سائنس کو وہ رخ عطا ہوگا جس سے طب جدید کی میکانیت ختم ہونے میں

مدد ملے گی اور اس کار روحانی عنصر تقویت پائے گا۔

طبی نصاب کا ایک مضمون ہونے کی وجہ سے امور طبعیہ پر ہر زمانہ میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ عربی و فارسی میں اس سلسلہ کی بکثرت نصابی و غیر نصابی کتابوں کے علاوہ اردو میں بھی اس موضوع پر کافی مواد مہیا کیا گیا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں خالص نصابی نقطہ نظر سے متعدد کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنے اسلوب اور زبان و بیان کے امتیاز و اعتبار کے ساتھ طلبہ کے لئے کسی نہ کسی حد تک مفید کہی جا سکتی ہے۔ پیش نظر کتاب "الکلیات الامور الطبعیہ" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے موجودہ نصاب اور طلبہ کی استعداد کو ملحوظ رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔

اس کے مرتب حکیم ابوالخیر اصلاحی یونانی میڈیکل کالج الہ آباد کے فارغ اور ابن سینا طبیہ کالج بیناپارہ اعظم گڑھ کے لائق استاد ہیں۔ انہوں نے اپنے مطالعہ اور تدریسی تجربہ کی روشنی میں اسے موضوع قلم بنایا ہے اور سلیس و سادہ زبان میں اس کے مباحث پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے طلبہ کے لئے یہ مفید اور کار آمد ثابت ہو گی۔

۱۹ر نومبر ۱۹۸۴ء

OO

تقدمہ حفظان صحت اور حمام

انسان کو ابتدائے آفرینش سے پانی کی اہمیت اور زندگی کے لئے اس کی ضرورت اور تاثیر کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لئے اس نے اپنی آبادیاں اور بستیاں پانی کے چشموں کے قریب قائم کیں۔ دنیا کے قدیم ترین شہر تالابوں اور نہروں کے آس پاس آباد ہیں۔ تہذیبی ترقی کے ساتھ انسان نے نظافت اور صفائی پر توجہ شروع کی۔ صفائی کے اہتمام میں اضافہ سے حمام کی اہمیت بڑھی اور انسانی سماج میں اسے منزلت حاصل ہوئی۔ شہروں کی تعمیر میں حمام کا خاص خیال رکھا گیا۔ منزلت اور منصبی حیثیت کی وجہ سے آگے چل کر اس نے اجتماعی کلب اور سماجی انجمن کی شکل اختیار کی۔

بلاد شام میں پھیلی ہوئی مختلف تاریخی زمانوں کی نہریں اس کا ثبوت ہیں کہ پانی کا استعمال اور اس کے منتقل کرنے کے طریقوں میں زمانہ کے ساتھ کتنی ترقی ہو گئی تھی۔ رومی عہد میں عام حماموں کی کثرت ہوئی۔ بعض رومی شہنشاہوں نے اہتمام سے حمام تعمیر کئے۔ جیسے انطاکیہ کے حمام اور دیو کلیسیان کا حمام جو تدمر میں واقع تھا۔ افامیا کی کھدائی میں جو عمارتیں ملی ہیں ان سے بھی حماموں کا پتہ چلتا ہے۔ بُصریٰ میں بھی اسی طرح کے آثار پائے جاتے ہیں۔

ترکی حمام کی روایت کا تعلق بہت پرانے زمانہ سے ہے، اس زمانہ سے پہلے جب ترک اناطولیہ نہیں پہنچے تھے۔ ترک جب اناطولیہ پہنچے تو وہ اپنے ساتھ حمام کی روایت لے کر آئے۔ رومی اور بازنطینی تہذیبوں سے ان کا ملاپ ہوا۔ تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتی ہیں وہ گلے ملتی ہیں۔ اس تہذیبی انضمام اور مقامی اثر سے حمام میں بعض تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسلامی فکر اس میں نمایاں طور پر شامل تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب سے جس کا تعلق نظافت اور پاکیزگی سے تھا، اور جس میں پانی کے استعمال کا لازم احترام کیا گیا تھا، حمام کے بالکل نئے تصور نے جنم لیا اور ترکی حمام Turkish

---

مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰

Bathوجود میں آیااور اپنے غیر استحصال پذیر رسوم اور مخصوص نظام کی وجہ سے اسے ایک ادارہ کا درجہ حاصل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترکی حمام نے جلد کی صفائی اور طبی ضرورت سے کہیں زیادہ ایک دوسری جگہ کی حیثیت حاصل کرلی تھی، جو روزمرہ کی زندگی سے جزءلاینفک کے طور پر جڑی ہوئی تھی۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہر طبقہ اور خیال کے لوگ جوان اور بوڑھے، امیر اور غریب، شہری اور دیہاتی آزادی کے ساتھ جمع ہوتے تھے۔ حمام ان کے لئے ایک دوسرے سے ملنے اور متعارف ہونے کی جگہ تھی۔ زندگی کی اہم تقریبات وہاں منعقد ہوتی تھیں۔ بچہ کی ولادت کے بعد چلہ کا غسل اور دلہن کا غسل، جس میں کھانے اور گانے کا بھی اہتمام ہوتا تھا اس کی مثالیں ہیں۔

اسلامی عربی حمام بعض لوگوں کے مطابق قدیم یونانی حمام کی نقل ہیں۔ دوسروں کے خیال میں وہ ابتدائی عیسوی صدیوں کے رومی، بازنطینی اور قدیم شامی حمام سے مشتق ہیں، جو شروع زمانہ میں معمولی حالت میں ہوتے تھے۔ دکتور عفیف بہنسی کا خیال ہے کہ عہد اسلامی کے حمام قدیم شامی حمام کی تعمیری روایات کا استمرار ہیں جو کہ ہلنستی زمانہ کی ابتداء سے رائج تھے پھر انہوں نے رومی زمانہ میں ترقی پائی۔ ان کے آثار انطاکیہ اور افامیا کے حمامات اور تدمر اور بُصریٰ اور شہبا میں ملتے ہیں، یہ حمامات عام طور پر عادت اور رسم کے مطابق تین قسموں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایک قسم بارد، دوسری معتدل، تیسری حار۔

تسمیم: یعنی بیت النار یا بھٹی والا حصہ وہ ہوتا تھا جو حمام کے پانی کو گرم کرتا تھا۔ پکی ہوئی مٹی کی نالیوں (انابیب) یا پتھر کے نلوں کے ذریعہ حمام کے مختلف حصوں میں پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حمام کی تعمیر رومی معماروں کی ایجاد نہیں تھی۔ ان سے پہلے شامی معمار دوہزار برس قبل سبقت کرچکے تھے۔ شاہی محلات میں حمامات کی سہولت فراہم کی گئی تھی اور تاریخی ذرائع سے یہ یقینی ہے کہ حمام ایک ایسی روایت ہے جو وادی نیل اور ملک شام میں رومیوں سے صدیوں پہلے موجود تھی۔ عہد اسلامی میں بھی حمام سب سے پہلے بلاد شام میں تعمیر کئے گئے۔ شام کی دیرینہ روایت کے

ساتھ وہ پہلی خلافت امیہ کا مستقر بھی تھا۔ حمام قُصیر عُمرہ، اسلامی عہد کا پہلا حمام ہے جو شام میں تعمیر ہوا۔ حمام قصر الحیر غربی، ہشام بن عبدالملک (۷۴۴ء۔۷۲۳ء) کے زمانہ میں دمشق میں بنایا گیا تھا۔ یہ بڑا حمام تھا اور محل کے شمال میں واقع تھا۔ اس حمام کے نقشہ سے اموی حمامات کا رومی حمامات سے اختلاف واضح ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموی خلافت نے حمامات کی تعمیر کی تنظیم کی۔ ان کی جگہوں کو متعین کیا۔ انہیں پانی کے چشموں سے جوڑا اور استعمال شدہ پانی کو نالیوں کے ذریعہ باہر نکالنے کا نظم کیا۔ حمام کے کمروں پر عام طور پر قبے بنائے جاتے تھے جن میں روشن دان ہوتے تھے جو شیشوں کے ٹکڑوں سے بنے ہوتے تھے۔ ان سے روشنی آتی تھی لیکن ہوا کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ حمام کی تعمیر میں عام طور پر پکی اینٹ، سنگ مرمر اور پتھر استعمال کیا جاتا تھا۔ حمام کے پیچھے بھٹی کی جگہ ہوتی تھی جہاں تانبہ کی بڑی دیگوں میں پانی گرم کیا جاتا تھا اور پکی مٹی کے پائپ سے پانی اور بھاپ حمام کے مختلف حصوں میں پہنچتا تھا۔ بھٹی کی جگہ پیچھے دروازہ ہوتا تھا تاکہ لکڑی وغیرہ جلانے کا سامان رکھا جاسکے۔

جہاں تک ان قدیم عربی حمامات کا تعلق ہے، جو عہد اسلامی سے پہلے بازنطینی زمانہ میں بنائے گئے تھے۔ ان کا پتہ فرات کے کناروں پر واقع حلبیہ اور زلبیہ شہروں کے آثار سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ رومی حمام سے اس اعتبار سے مختلف ہوتے تھے کہ ان میں گرم ہوا اور گرم بھاپ پھیلانے کے لئے زیر زمین نالیاں نہیں ہوتی تھیں۔

آج کے زمانہ میں بڑی عمارتوں کو ٹھنڈا یا گرم رکھنے کیلئے موٹے موٹے پائپ چھت کے ساتھ لگائے جاتے ہیں اور ان سے گرمی میں ٹھنڈی اور جاڑے میں گرم ہوا مختلف کمروں اور حصوں میں پہنچائی جاتی ہے، یعنی ایک مرکزی کمرے میں گرمی یا ٹھنڈک پیدا کر کے اس کو مختلف کمروں میں حسب ضرورت پہنچایا جاتا ہے۔

حمام عربی لفظ حمّ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی گرم کرنے والا یعنی بھاپ کا غسل خانہ ہے۔ فرانسیسی میں اسے Bain Maure کہتے ہیں۔

حمام کی ایک پوری بڑی عمارت ہوتی تھی اور اسے کافی آرائش اور اہتمام سے تعمیر کیا جاتا تھا۔ عام طور پر حمام درج ذیل بنیادی حصوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

۱۔ القسم البرانی (بیرونی حصہ، القسم البارد) یہ ایک چھت دار ہال ہوتا تھا۔ چھت پر قبے بنے ہوتے تھے اور ان کے چاروں طرف رنگین شیشہ کے روشن دان ہوتے تھے۔ اس میں سب سے اوپر برج جیسی چیز بنائی جاتی تھی جس میں کئی روشن دان ہوتے تھے۔ یہ حصہ عام طور پر چوکور اور کشادہ ہوتا تھا اس کے درمیان میں ہشت پہلو حوض اور فوارہ ہوتا تھا۔ اور کسی ایک طرف نالی رہتی تھی یہ فالتو پانی کو اس نالی کی طرف لے جاتی تھی جو غسل خانوں میں جاتی تھی۔ اس بیرونی ٹھنڈے حصہ میں چار ایوان ہوتے تھے۔ ہر ایوان میں بیٹھنے کیلئے ایک چبوترہ اور کپڑے رکھنے کی جگہ ہوتی تھی۔

۲۔ القسم الوسطانی (ماء فاتر، نیم گرم) بیرونی حصہ کے دروازہ کی دہلیز سے اس میں داخل ہوتے تھے۔ اس کے ایک گوشے میں معمول کے مطابق غسل خانے ہوتے تھے۔ یہ وسطانی حصہ دو ہال پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک میں پتھر کی حوضریاں (بڑے مٹکے) رکھی ہوتی تھیں، جن میں ٹھنڈے اور گرم پانی کی ٹونٹیاں لگی رہتی تھیں۔ گرمی کے زمانہ میں جوانی حصہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی یہ درمیانی حصہ ہی کافی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں حرارت کم اور لطافت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر ان ہالوں سے بہت سے چھوٹے کمرے (خلوتیں) وابستہ ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر کمرہ میں نہانے کے لئے حوضری ہوتی تھی۔

۳۔ القسم الجوانی (اندرونی حصہ القسم الحار Sauna ساؤنا) درمیانی حصہ کے ایک ٹیڑھے راستے سے گزر کر اس میں داخل ہوتے تھے۔ یہ ایک کشادہ ہال پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کے چاروں طرف ایوانات ہوتے تھے، جن کے اطراف میں پتھر کی حوضریاں مٹکے نما ظروف رکھے ہوتے تھے۔ ہر ایوان کے کناروں اور اس کے بیچ میں کمان دار دروازے کھلتے تھے۔ یہ دروازے خلوتوں (مقصورہ) تک پہنچاتے تھے۔ مقصورہ دراصل ایک چھوٹے کمرہ کی شکل کا ہوتا تھا جس میں پتھر کی حوضری ہوتی تھی۔

اس حوضری میں چار آدمیوں کی گنجائش رہتی تھی۔

قسم جوانی کے نیچے یا برابر میں پانی اور بھاپ تیار کرنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

اس میں درج ذیل چیزیں ہوتی تھیں۔

۱۔ بیت النار (بھٹی)

۲۔ خزان للماء البارد۔ ٹھنڈے پانی کا اسٹور

۳۔ خزان تولید البخار۔ بھاپ پیدا کرنے کی جگہ

۴۔ خزان للماء الساخن۔ گرم پانی کا اسٹور

۵۔ الخزان الاحتیاطی۔ محفوظ ذخیرہ

۶۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کا نیٹ ورک تاکہ پانی کو حمام تک بلا کسی دباؤ کے لے جایا جا سکے۔

حمام اور اس کے کارکنوں کیلئے جو اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں وہ یہ تھیں۔

۱۔ وقاد۔ بھٹی جلانے والا۔ اسے سخان بھی کہا جاتا تھا۔

۲۔ زبال۔ بھٹی کے سامان کی فراہمی کا نگراں۔ اسکے لیے غبار کی بھی اصطلاح تھی۔

۳۔ صاحب الصندوق یا گلاس: کپڑے تبدیل کرنے والے کمرہ کا نگراں اس کے لیے مختلف شہروں میں الگ الگ اصطلاحیں تھیں۔ دمشق میں اسے معلم یا مالک بھی کہا جاتا تھا۔

۴۔ قیم: حمام کا مستاجر

۵۔ مزین: بال بنانے والا

۶۔ حجام: سینگھی لگانے والا

۷۔ کیاس یا طیاب: مالش کرنے والا۔ مالشیے کو مکیس بھی کہتے تھے۔

۸۔ مشلح: پہلا کمرہ جس میں کپڑے اتارتے ہیں اور آرام کرتے ہیں مشلح کہلاتا ہے ایران میں اسے رخت کن کہتے ہیں۔

۹۔ مصطبہ: نہانے والوں کے لیے پتھر کی سیٹ

۱۰۔ مَغطس: پتھر کی چھوٹی چھوٹی حوضریاں۔

اسلامی عہد میں حماموں کی کثرت کا یہ عالم ہوا کہ عوامی حمام اور امراء کے مکانات میں بنائے گئے حماموں کے علاوہ بڑی مساجد سے بھی حمام ملحق ہوتے تھے۔ اس سے صفائی اور غسل کا اہتمام ظاہر ہوتا ہے۔ مورخین نے دمشق، بغداد، قرطبہ، استنبول، اصفہان اور دوسرے اسلامی شہروں میں حماموں کی جو کثیر تعداد لکھی ہے وہ چھ سو سے بھی متجاوز ہے۔ اس سے ان شہروں کی آبادی اور ترقی کا نشان ملتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ امتیاز حلب کو حاصل ہے۔ حلب کی پہچان اس کے حماموں کی وجہ سے تھی۔ تاریخی مصادر ظاہر کرتے ہیں کہ کبھی اس چھوٹے شہر کے حماموں کی تعداد ۱۷۷ تک پہنچ گئی تھی۔ ابن شداد نے وہاں ۱۹۵ حماموں کا ذکر کیا ہے۔ اس تعداد میں وہ حمام شامل نہیں ہیں جو ذی حیثیت افراد کے مکانات میں ذاتی استعمال کے لیے تھے۔ مورخین کے مطابق حماموں کی یہ کثیر تعداد بھی وہاں لوگوں کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی۔ حلب اور اسی طرح دمشق میں ایوبی عہد کے تیرہویں صدی کے بعض حمام اب تک موجود ہیں۔ ایوبی عہد کے حماموں کا مورخین نے خصوصی دلچسپی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

میں نے ایران، اردن اور شام کے سفروں میں کھدائی میں دریافت حماموں کے آثار کے ساتھ ان حماموں کو بھی دیکھنے کی کوشش کی جن کی عمارتیں محفوظ ہیں۔ یہاں میں صرف دمشق کے ایک حمام کا ذکر کرنا چاہوں گا، جسے گورنر دمشق (حاکم دمشق) اسعد پاشا العظم نے اپنے محل تعمیر کردہ ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں بنوایا تھا، قصر العظم سے موسوم یہ محل آج کل دمشق کا ایک نہایت شاندار میوزیم ہے۔ اس کا حمام قابل دید ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں بطور تمثال حمام کراتے دکھایا گیا ہے۔ اس میں چار کمرے ہیں۔ سب سے اندر کا کمرہ تسخین ماء کے لیے ہے۔ اینٹ کا بھٹی نما حصہ، نیچے آگ جلاتے تھے۔ پانی گرم ہو کر جوانی کمرے میں آتا تھا۔ دوسرا کمرہ جو جوانی اور وسطانی کے درمیان واقع ہے، اس کو حد فاصل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس

کمرہ کے لیے یہ نام مجھے یہاں کے علاوہ اور کہیں نہیں ملا۔ اس میں ماء فاتر سے غسل کیا جاتا تھا۔ تیسرے وسطانی کمرہ میں غسل کے بعد کپڑے وغیرہ تبدیل کرتے تھے اور زینت و آرائش کرتے تھے۔ وسطانی کے بعد راہداری سے گزر کر ایک بڑا کمرہ قہوہ اور آرام کے لیے ہے۔

حمام کا یہ مطالعہ محض تاریخی لحاظ سے تھا۔ مگر میں ان حماموں میں بھی گیا جہاں آج بھی حمام کا سلسلہ روایتی اہتمام سے جاری ہے۔ ان میں دمشق میں واقع نورالدین زنگی کا قائم کردہ حمام، تاریخی منزلت اور قدامت ہی کی وجہ سے اہم نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ وہاں کا سب سے بڑا اور اچھا حمام سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس میں پورے روایتی اور مروجہ طریقہ کے مطابق حمام کیا۔ اس حمام کو نورالدین زندگی نے ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء میں بنوایا تھا۔ ۱۴۰۰ھ/۱۹۷۹ء میں اس میں ترمیم کی گئی۔ یہ جامع اموی سے تھوڑے فاصلہ پر سوق البزوریں میں واقع ہے اس بازار میں پہلے مفردات کی دوکانیں رہی ہوں گی۔ اب زیورات اور دوسری اشیاء کی دوکانیں ہیں۔ اسی کے قریب ۱۱۵۴ء میں نورالدین زندگی (وفات ۱۱۷۴ء) کے قائم کردہ بیمارستان نوری کی عمارت ہے۔ اسے اب طبی متحف (میوزیم) میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ طبی مدرسہ ہے جہاں علاء الدین قرشی ابن نفیس جیسے فاضل طبیب و مصنف اور ابن القف جیسے ماہر جراح نے تعلیم پائی تھی۔ اور جہاں عبدالرحیم الدخوار جیسے یگانہ عصر استاد نے درس دیا تھا۔ اس متحف کی تفصیل ایک دیگر مضمون کی متقاضی ہے۔ یہ دمشق کا سب سے قدیم اور بہت تاریخی علاقہ ہے۔ یہاں اہل بیت میں رقیہ بنت حسین کی زیارت گاہ، صحابہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کا مزار اور سلاطین میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا مقبرہ واقع ہے۔ تھوڑے فاصلہ پر قبرستان باب الصغیر میں ازواج مطہرات میں حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت حفصہؓ، اہل بیت میں ام کلثومؓ بنت علی، سکینہ بنت حسینؓ، عبداللہ بن جعفر طیار، عبداللہ بن جعفر صادق، میمونہ بنت حسنؓ، صحابہ میں حضرت بلال حبشیؓ، حضرت عبداللہ بن مکتومؓ، علماء میں ابن قیم جوزی، ابن عساکر اور حکماء میں

ابو نصر فارابی کی آرام گاہیں ہیں۔

حمام کے بیرونی دروازہ سے میں پہلے کمرہ یعنی القسم البرانی میں داخل ہوا، یہ بہت بڑا چوکور ہال کی شکل کا تھا۔ سجا ہوا اور آراستہ۔ قدیم حماموں کے تذکرہ میں بھی بیرونی کمرہ کی تزئین و آرائش کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں اچھے قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ بنچوں کے ساتھ گدے اور تکیے لگے ہوئے تھے درمیان میں فوارہ تھا، حقہ اور چائے کا انتظام تھا۔ یہ استقبالیہ کمرہ کا بھی کام دیتا ہے اور یہیں پیسوں کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ حمام کا منیجر ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کپڑے اتارنے اور واپسی پر آرام کرنے کا کمرہ ہے۔ میں نے یہاں کپڑے اتارے اور تہبند باندھا۔ وسطی کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے راہداری نما کمرہ سے گزرنا پڑا۔ راہداری نما کمرہ کا درجۂ حرارت پہلے کمرہ سے نسبتاً زیادہ تھا۔ سردی کے دنوں میں یہاں کپڑے اتارے جاتے ہیں اور غسل سے واپسی پر تولیہ سے بدن پوچھتے ہیں۔ اس کمرہ کو وسطانی برانی کہتے ہیں۔ اس کے بعد والا کمرہ وسطانی جوانی تھا۔ میں ان دونوں کمروں سے گزر کر سیدھا آخری بھاپ والے کمرہ جوانی میں پہنچا۔ جیسے جیسے آگے چلتے ہیں کمروں کی حدت اور رطوبت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں نہانے والوں کے لیے تین چار چھوٹی حوضریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان حوضریوں میں نل کے ذریعہ تیز گرم پانی آرہا تھا۔ میں نے ایک حوضری کے پاس بیٹھ کر مگے سے بدن پر گرم پانی ڈالنا شروع کیا۔ پورے کمرہ میں گرم بھاپ پھیلی ہوئی تھی۔ گرم پانی اور گرم بھاپ نے فوراً اثر دکھایا اور چند منٹ سے زیادہ بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ بھاپ کی وجہ سے کمرہ میں اندھیرا سا تھا۔ بھاپ کا نظام مجھے نظر نہیں آیا۔ میں اس سے نکل کر وسطانی جوانی کمرہ میں آیا۔ یہاں نیم گرم پانی (ماء فاتر) سے غسل کرنے سے پہلے مالش اور مساج کا خیال ہوا۔ برابر کے کیبن میں اس کا انتظام تھا۔ مرد کارکن بدن کو رگڑتے اور دباتے ہیں اور مالش کر کے بدن کو صابن سے دھوتے ہیں۔ تہران میں اس کی انجام دہی زیادہ بہتر طور پر دیکھی گئی تھی۔ یہاں بالکل اچھا نہیں لگا۔

دلک کے بعد میں نے وسطانی جوانی کمرہ میں نسبتاً ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔

یہاں کئی حوضریاں تھیں جن میں ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس بڑے کمرہ کے اطراف چھوٹے چھوٹے مقصورے تھے۔ حمام کے بعد بہت لطافت اور فرحت محسوس ہوئی۔ وسطانی برانی کمرہ میں آکر تولیہ سے بدن صاف کیا دوسرا تہبند بدلا اور بیرونی آرائشی کمرہ میں آیا۔ اس کے ایک حصہ میں ایئر کنڈیشنر بھی لگا ہوا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے کچھ وقت آرام کی خاطر گزارا اور چائے پی۔ اس طرح نہ صرف اس حمام میں چار کمرے تھے، جن کے نام میں نے ابھی لیے۔ یعنی بیرونی آرائشی کمرہ دو درمیانی کمرے اور ایک بھاپ کا کمرہ۔ بلکہ اسلامی عہد کے حماموں کے بیان میں بھی چار کمروں کا ذکر ملتا ہے۔ قصر العظم میں بھی بہت عمدہ چار کمرے بنے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا ان حماموں نے وہاں کے باشندوں کی اجتماعی و سماجی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ صرف نہانے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ اس کی حیثیت اسپورٹس کلب، انجمن اور تہذیبی و سماجی اجتماع گاہ کی تھی۔ لوگ جمع ہو کر ہر قسم کی گفتگو کرتے تھے۔ عورتوں کے لیے ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے مردوں کا قہوہ خانہ۔ ان کے لیے یہ تفریح کی خاص جگہ تھی، وہ بہت وقت وہاں گزارتی تھیں۔ کھانے پینے کا سلسلہ رہتا تھا اور اکثر حمام تعارف، ملاقات اور منگنی کا موقع فراہم کرتے تھے۔ لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ نجی حمام گھروں میں بننے لگے اور شہروں میں مختلف قسم کے کلب قائم ہو گئے تو آہستہ آہستہ حماموں کی اجتماعی اہمیت ختم ہو گئی۔ فیشن ایبل اور ذی ثروت لوگوں کے لیے اب ان میں تفریح اور دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ عام لوگوں کا تعلق ضرور برقرار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردن اور شام کے مقابلہ میں ایران میں حمام کی روایت زیادہ بہتر طور پر انجام پذیر ہے۔

معاشرتی اہمیت کے ساتھ حفظان صحت اور علاج امراض میں حمام کا بہت نمایاں حصہ رہا ہے۔ بدن کی صفائی اور تحفظ صحت کے علاوہ یہ مختلف بیماریوں کا کامیاب علاج سمجھا جاتا ہے۔ حمام کے لیے ایک خاص اصطلاح "الطبیب البکوش" استعمال کی جاتی تھی یعنی "خاموش طبیب۔" طب یونانی میں علاج بالتدبیر میں حمام کو خاص درجہ حاصل ہے

اس کی ذاتی افادیت کے ساتھ دلک اور ریاضت کا بھی اس سے رشتہ جڑا ہوا ہے۔ تدبیری علاج کے ان دو اہم ذرائع کا یہ لازمی جزو ہے، اس کے بغیر ان کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔

ابتدا میں ٹھنڈے پانی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور حوض، تالاب، دریا اور کھلی جگہ میں لوگ نہاتے تھے۔ لیکن ترقی کے ساتھ گرم پانی کو غسل کے لیے استعمال کیا گیا اور حمام کا رواج پڑا۔ پھر آگے چل کر مختلف معدنیات اور دوائیں پانی میں شامل کی گئیں اور ان کے ذریعہ طبی فوائد حاصل کیے گئے۔ غسل آبی کے علاوہ غسل رملی، غسل شمسی، غسل قمری، غسل ہوائی اور غسل روغنی نے طبی اغراض کے لحاظ سے جگہ پائی۔ ابن سینا نے غسل رملی، غسل شمسی اور غسل روغنی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ نپولین کی بہن کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دودھ کے ٹب میں نہاتی تھی۔ امراء کی بیگمات پانی میں عطریات، گلاب، مشک، عنبر، کیوڑہ اور خوشبوؤں کا اضافہ کرتی تھیں۔

غسل کو مذہبی اہمیت بھی حاصل تھی۔ گنگا اور دوسری ندیوں میں اشنان اس کی ایک نہایت قدیم مثال ہے۔ اسلام میں بھی اسے بعض صورتوں میں سنت، واجب اور فرض کا درجہ دیا گیا ہے۔ نویں صدی قبل مسیح کے یونانی شاعر ہومر کے کلام میں محنت اور تکان کے بعد گرم پانی سے غسل کی افادیت کا ذکر ملتا ہے۔

غسل کا اصل اور براہ راست اثر جلد پر ہوتا ہے۔ اس سے دوران خون اور نظام اعصاب خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ عروق شعریہ سطح جلد تک جو فضول مواد پہنچاتی ہیں وہ جلدی مسامات کے ذریعے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ غسل سے بند مسامات کھلنے سے زیر جلد معتقن فضلات اور جمع شدہ مواد کے اخراج میں مدد ملتی ہے۔ گرم حمام سے پسینہ کے ساتھ ضرر رساں مواد کا اخراج بڑھ جاتا ہے۔ اور دوران خون تیز ہو جاتا ہے۔ گرم پانی سے جہاں عروق شعریہ پھیلتی ہیں اور سطح جلد کا دوران خون بڑھتا ہے وہاں پسینہ کے غدد کا عمل تیز ہونے سے مواد باہر نکلتے ہیں۔ اس کے برخلاف ٹھنڈے پانی سے عروق شعریہ سکڑتی ہیں اور خون کا دوران بیرونی سطح سے اندرونی

اعضاء کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اطبا نے اسے قلب کے لیے باعث تقویت بتایا ہے۔

غسل آبی میں سادہ پانی (سافٹ واٹر) جس میں کسی چیز کی آمیزش نہیں ہوتی اور مرکب پانی جس میں معدنیات مثلاً نمک، چونا، رماد، کبریت، بورہ ارمنی، حجرالیہود، پھٹکری، کسیس، تانبا، لوہا اور ادویہ مثلاً مویزج، حب الغار، برگ نیم، برگ انار، برگ بیر وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے۔

جن امراض میں حمام خاص طور پر مفید ہے۔ ان میں وجع مفاصل، نقرس، عرق النساء اور مختلف مقامات کے درد شامل ہیں۔ فالج، لقوہ، استرخاء اور دوسرے بلغمی امراض میں اس کی گرم فضا مریض کے موافق ہوتی ہے۔ وضع حمل میں سہولت کے لیے بھی خواتین کو حمام کرایا جاتا ہے۔ ابن سینا کے مطابق حمام کا اصل فائدہ تسخین و ترطیب ہے۔ پہلا کمرہ بار در طب، دوسرا حار رطب اور تیسرا حار یابس ہوتا ہے۔ اس نے پہلے آرائشی یا استقبالیہ کمرہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا ہے کہ اس کا تعلق براہ راست طب سے نہیں ہے۔ ابن سینا کے مطابق حمام خشک جس میں بدن پر پانی نہیں ڈالا جاتا، استسقاء، ترہل، سمن مفرط اور رطوبت بدن کی زیادتی میں مفید ہوتا ہے۔ اور حمام رطب جس سے بدن میں رطوبت پیدا ہوتی ہے لاغروں، مدقوقوں اور گرم و خشک مزاج والوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ حمام میں زیادہ دیر ٹھیرنے سے بدن میں خشکی اور کم دیر ٹھہرنے سے رطوبت پیدا ہوتی ہے۔ ابن سینا نے حمام اور اس میں مستعمل پانی کے اثرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ طب کی دیگر کتابوں میں اس کے منافع پر جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان کے بیان کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے، وہ عام طور پر معلوم ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ اس قدر اہم اور مفید طریقہ علاج پر ہماری کوئی توجہ نہیں ہے اور یہ ہمارے درمیان سے نکلا ہوا ہے۔ اگر مرکزی وزارت صحت، طب یونانی کی مرکزی تحقیقاتی کونسل، طبی کالج یا طبی معالجین کے زیر اہتمام کسی شہر میں روایتی طریقہ پر حمام تعمیر کیا جائے تو یہ بہت سے امراض کے علاج کا ایک کارگر ذریعہ ہوگا۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے تدبیری طریقوں کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔

آیورویدک میں پنچ کرما اور دوسری غیر دوائی شکلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ یونانی نظام علاج میں حمام اور علاج بالتدبیر کے ذرائع کو رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کے تعلق سے دوسری طبوں سے کہیں زیادہ مواد طب یونانی میں موجود ہے۔ اس طرح یونانی علاج میں نہ صرف لوگوں کی دلچسپی اور رغبت بڑھے گی اور اس کا بہتر تعارف سامنے آئے گا، بلکہ علاج میں بھی اس سے موثر طور پر فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔ بھاپ کے کمرہ میں بھٹی کی جگہ بوائلر اور پانی اور فضا کے درجۂ حرارت کے تعین کے لیے دوسرے سائنٹفک طریقوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نوجوان فاضل مختار احمد قاسمی نے حمام کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ انہوں نے بڑی محنت اور کاوش سے حمام کے تاریخی پس منظر کے ساتھ اس کی تدابیر، فوائد اور مضرتوں وغیرہ پر تفصیل سے مواد پیش کیا ہے۔ شعبہ کلیات کے زیر اہتمام حفظان صحت کے اس اہم موضوع پر ان کا یہ تحقیقی مقالہ اس سلسلہ کی پہلی بڑی کامیاب کوشش ہے۔ اس تحقیقی کام کے لیے وہ مستحق تحسین ہیں۔ ڈاکٹر مختار احمد قاسمی نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی ہے۔ طبیہ کالج علی گڑھ کے ذہین طالب علموں میں ان کا شمار رہا ہے اور وہ لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی اس کتاب کے ذریعہ یونانی حلقوں میں حمام سے دلچسپی بڑھے گی اور اسے از سر نو متعارف کرانے میں مدد ملے گی۔

۲۲ر جولائی ۱۹۹۹ء

OO

تقدمہ تشریح البدن

(حصہ اول ہیکل عظمی)

علم تشریح کا تعلق طب کے ان مضامین سے ہے جن کی طرف ابتداء ہی سے اطباء کی خصوصی توجہ مبذول رہی اور اس پر مستقل کتابیں سپرد قلم کی گئیں۔ یونانی عہد میں ہیرو فیلوس اور ایراسیسٹر اطوس دو ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنہوں نے علم تشریح پر لازوال نقوش ثبت کیے ہیں۔ ہیرو فیلوس ان ماہرین تشریح میں ہے جس نے تقریباً چھ سو انسانی نعشوں کو ڈسیکشن کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس کی بعض تشریحی اصطلاحات مثلاً معصرہ ہیرو فیلوس (Trochuler Herophili) آج بھی ہمارے درمیان مستعمل ہیں۔ جالینوس نے اس مضمون کو مزید وسعت دی اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ بعد میں اطباء اسکندریہ نے جالینوس کی تصانیف پر مبنی جو نصاب ترتیب دیا، اس میں علم تشریح نے بھی جگہ پائی اور نصاب کے ایک مضمون کے طور پر علم تشریح کے مطالعے کو خاص فروغ حاصل ہوا۔ عربی عہد میں نہ صرف قدیم یونانی مشرحین کی کتابیں عربی زبان میں منتقل کی گئیں بلکہ عرب تشریح دانوں نے یونانی تشریحی معلومات پر اضافہ کیا اور ذاتی تحقیق کی روشنی میں کتابیں تصنیف کیں۔ ابن ماسویہ، عبداللطیف بغدادی، ابن نفیس وغیرہ ان قابل ذکر مصنفین میں ہیں جن کی تشریحی تحقیقات ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

عربی ہی کی طرح فارسی مصنفین نے بھی اس موضوع کو پوری اہمیت دی۔ تشریح منصوری طب کی ان کتابوں میں شامل ہے جو طب کے فارسی نصاب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندوستانی طبی درسیات میں بھی اس کا مرتبہ رہا۔ طب کے دوسرے

نیو پبلک پریس دہلی ۱۹۸۶ء

موضوعات منافع الاعضاء، ماہیت الامراض وغیرہ کے مقابلے میں اردو میں بھی اس مضمون پر زیادہ کام کیا گیا ہے اور نہ صرف ضخیم کتابیں بلکہ جامع و مختصر کتابیں بھی مرتب کی گئی ہیں۔

گزشتہ برسوں میں اس مضمون کی کئی اچھی کتابیں سامنے آئی ہیں۔ عزیزی علاء الدین خاں لیکچرر ہمدرد طبی کالج نئی دہلی کی زیر نظر کتاب بھی ان میں سے ایک ہے۔ جس میں علم العظام پر بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں طلبہ کی نصابی ضرورتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ علم تشریح کے درس کے دوران جو تجربات انہیں حاصل ہوئے وہ اس کی ترتیب کے وقت ان کے پیش نظر رہے۔ کسی کتاب کی خوبی اور قدر و قیمت کا اندازہ اس مضمون کی متعدد کتابوں کے مطالعے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہر لکھنے والے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے اور اس کے طرز کی ندرت اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کاوش جو اگرچہ تصنیفی لحاظ سے نقش اول ہے، طلبہ کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل کرے گی اور مختلف نظامہائے تشریح سے متعلق اس کے دوسرے حصے بھی جلد اشاعت پذیر ہوں گے۔

۲۷ر فروری ۱۹۸۳ء

OO

تقدمہ تشریح البدن

(حصہ دوم مفصلیات وعضلیات)

علم تشریح طبی نصاب کا ہمیشہ ایک اہم مضمون رہا۔ قدیم یونانی مصنفین نے اس موضوع پر کافی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ دارالعلوم اسکندریہ میں بطالمہ کے زمانہ میں علم تشریح نے خاص طور پر ترقی کی۔ وہاں نہ صرف اس کی نظری اور کتابی تعلیم پر توجہ دی گئی بلکہ عملی طور پر ڈسیکشن کے ذریعہ طلبہ کو اس کی معلومات بہم پہنچائی گئیں۔ بطلیموسی شہنشاہوں کے فرمان کے ذریعہ سرکاری طور پر تقطیع نعش کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ قانونی اجازت قدیم طبی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔ الکمیان، ہیراکلائی ٹس، انکساغورس، ابیذوقلیس، دیوجانس وغیرہ کے بعد دارالعلوم اسکندریہ سے وابستہ ہیروفلوس اور ایراسیسطراطوس ایسے قابل منزلت نام ہیں جن کی تحقیقات نے علم تشریح میں قابل قدر اضافے کیے اور تشریح کو طب کا اہم حصہ بننے میں مدد دی۔ بعض تشریحی اصطلاحات آج بھی ان کے نام سے موسوم ہیں اور اس عہد کی تشریحی ترقیات کی یاد دلاتی ہیں۔

جالینوس کو اس فن سے خاص شغف رہا اس کی بکثرت تصانیف میں تشریح کے چھوٹے بڑے بیس رسائل شامل ہیں۔ جالینوس کی تصانیف میں سے اطبائے اسکندریہ نے جو سولہ کتابیں درس کے واسطے منتخب کی تھیں اور جو طبی نصاب کے طور پر تقریباً چھ سو برس تک پڑھائی جاتی رہیں، ان میں کتاب التشریح الصغیر بھی شامل تھی۔ پانچ مقالات پر مشتمل اس کتاب کو اسکندرانی طبیبوں نے جالینوس کی مختلف کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔

جمن پبلی کیشنز، نئی دہلی

عرب اطباء نے تشریح کی روایات کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے بدن انسان کی ساخت کو خالق کائنات کی صناعی کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیا۔ اس کے مطالعہ کے ذریعہ تکوینی حکمت اور خدا کی عظمت کے یقین کے ساتھ طب میں تشریح کی اہمیت اور افادیت پر پورا زور دیا۔ ابن سینا نے لکھا ہے: "علاج امراض کے سلسلہ میں اعضاء کی خلقت، وضع، محل وقوع اور مشارکت وغیرہ کا علم ایک طبیب کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ورنہ علاج میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔" معالجہ کے علاوہ جراحت کے سلسلہ میں اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے: "جراح کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم تشریح، تشریح اعصاب، اور وہ اور شرائین سے اچھی طرح واقف ہو تاکہ ان کے کاٹنے کی غلطی کا مرتکب نہ ہو سکے۔" ابوالقاسم زہراوی کا بیان ہے: "علم جراحت کے لیے لازمی ہے کہ اس سے پہلے تشریح کا علم حاصل کیا جائے، یہاں تک کہ اعضاء کے منافع، ہیئت، مفاصل، عظام، اعصاب، عضلات کی معرفت، تعداد اور مخارج سے مکمل طور پر واقفیت ہو جائے۔"

عربی اور فارسی زبان میں تشریح پر نہ صرف مستقل تصانیف کا سلسلہ قائم رہا بلکہ ہر بڑی طبی کتاب کا ایک حصہ تشریح کے لیے وقف کیا جاتا تھا اور اس کے بغیر عام طبی کتاب نامکمل سمجھی جاتی تھی۔ فردوس الحکمت، کامل الصناعۃ، کتاب الملکی، القانون اور ذخیرہ خوارزم شاہی کے تشریحی حصے مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستان کے طبی نصاب میں کامل الصناعۃ اور قانون کے تشریحی حصوں اور قرشی اور گیلانی کی شرح تشریح کے علاوہ منصور بن محمد کی فارسی کتاب تشریح منصوری کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ دور آخر میں حکیم صادق علی خاں کی شرح تشریح اعضاء مرکبہ اس موضوع کی مقبول نصابی کتاب تھی۔ اسے انہوں نے شرح گیلانی سے تشریح اعضائے مرکبہ پڑھاتے وقت ضروری اضافہ کے ساتھ تالیف کیا تھا۔ جدید مغربی معلومات کے زیر اثر ہندوستان میں رابرٹ ہوپر کی انگریزی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ انیس المشرحین کے نام سے یہ ترجمہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک رکن جان

ٹٹلر نے کیا تھا اور یہ کلکتہ سے ۱۸۳۶ء میں چھپا تھا۔ انیس المشرحین طبی نصاب کے علاوہ محمڈن کالج کے نصاب میں بھی شامل تھی۔ اسی طرح سب سے پہلے عربی سے جس جدید تشریحی کتاب کا اردو میں ترجمہ ہوا وہ یوحنا ورتبات کی تشریح تھی۔ یوحنا ورتبات نے کتاب التوضیح فی اصول التشریح کے نام سے جدید تشریح کا عربی ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمہ میں انگریزی اصطلاحات کی ہم معنی اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں جو اردو میں نقل کر لی گئی تھیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں جدید طبی تعلیم کے آغاز کے بعد ماہر تشریح کی حیثیت سے جن یونانی طبیبوں نے نمایاں شہرت پائی ان میں پیر جی حکیم عبدالرزاق اور ان کے بعد حکیم نذیرالدین احمد کا نام لینا ضروری ہے۔ انہوں نے یونانی نصاب میں تشریح کی تدریسی بنیادوں کو استوار کیا اور قدیم تشریح کو جدید معلومات سے آراستہ کرنے پر اپنی بہترین کوششیں صرف کیں۔ مؤخر الذکر کی کتابیں تشریح معالجین اور تشریح عملی (رہنمائے تقطیع نعش) ہمارے تشریحی ذخیرہ کی بہترین کتابوں میں ہیں۔ رہنمائے تقطیع نعش کو اردو میں عملی تشریح کی پہلی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

اردو کی ابتدائی تشریحی کاوشوں میں تشریحات قطبیہ (مطبع نامی لکھنؤ) تشریحات شمسیہ (مطبع نامی) تشریح الاجسام، حقائق تشریح حکیم احمد الدین لاہوری قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد تشریحی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں تشریح کبیر حکیم محمد کبیرالدین، کتاب التشریح حکیم محمد شمس الحق خاں، التشریح حکیم گوردت سنگھ الگ، تشریح حبیب حکیم ملک عطاءاللہ حبیب، تشریح الہیکل، تشریح الاحشاء، اشراح حکیم کمال الدین حسین ہمدانی، الاحشاء حکیم محمد احمد لاری، علم العظام، علم المفاصل، سطحی تشریح حکیم انیس احمد انصاری، اناٹمی گائیڈ شاہد رشید صابری اچھی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں طبیہ کالجوں میں شعبۂ تشریح سے جو اساتذہ وابستہ ہیں ان میں عزیزی حکیم علاءالدین خاں ریڈر ہمدرد طبی کالج جامعہ ہمدرد نئی دہلی ایک امتیازی

حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تقریباً بیس سال سے اس کے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنے تشریحی شغف، مطالعہ اور درسی تجربہ کی روشنی میں انہوں نے تشریح پر قابل قدر کام کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ انکی پہلی کتاب تشریح البدن، (ہیکل عظمی) ۱۹۸۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ پیش نظر کتاب تشریح البدن کا دوسرا حصہ ہے جو مفاصل اور عضلات کے تفصیلی بیان پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ کی طرح اسے بھی سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ طلبہ کی نصابی ضرورت کے مطابق ہے اور اس سے سنٹرل کونسل کے نصاب کے تشریحی مطالعے میں مدد ملتی ہے۔

امید ہے کہ حکیم علاء الدین خاں کی یہ کوشش طبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرے گی۔

۲۳ر جولائی ۱۹۹۲ء

OO

تقدمہ قوانین ادویہ

طب یونانی اپنے قواعد و کلیات کی وجہ سے دوسرے نظام ہائے علاج کے مقابلہ میں امتیاز خاص کی حامل ہے۔ ان اصول و قواعد کا دائرہ منافع الاعضاء اور ماہیت الامراض سے لے کر علم الادویہ اور معالجات تک پھیلا ہوا ہے۔ کلیاتی مباحث میں امور طبعیہ کے مسائل کی طرف خصوصیت کے ساتھ علماء طب کی بہت توجہ مبذول رہی ہے۔ یونانی عہد میں بقراط و جالینوس نے ان پر علیحدہ سے رسالے لکھے ہیں۔ اسی طرح عربی عہد میں ان کو مطالعہ و تحقیق کا خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ابن سینا نے قانون میں ان امور پر نہایت عالمانہ انداز میں لکھا ہے۔ قانون کا یہ کلیاتی حصہ ہر دور میں اہل علم کے لئے مرکز نظر بنا رہا اور اس کے مطالعہ اور حل مباحث میں طبی محققین کی بہترین صلاحیتیں صرف ہوئیں۔ طبی ذخیرے میں اس موضوع کی بکثرت کتابیں دوسرے مضامین طب کیلئے باعث رشک ہیں۔ درس و تدریس میں بھی اس کی یہ فضیلت قائم رہی۔ کلیات کا درس ہر استاد کے بس کی چیز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ فاضل اساتذۂ وقت ہی اس کے درس کے اہل سمجھے جاتے تھے اور اس کے لئے طب اور عربی زبان کی قابلیت کے ساتھ فلسفہ اور دوسرے علوم قدیمہ میں اعلیٰ مہارت ضروری تھی۔

کلیاتی مضامین میں امور طبعیہ کی طرف جس قدر توجہ مبذول ہوئی وہ کلیات علاج اور کلیات ادویہ کو حاصل نہیں ہوئی لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اصول ادویہ کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ قوانین و احکامات ادویہ پر نہ صرف معالجات اور مفردات و مرکبات کی کتابوں میں لکھنا ضروری سمجھا گیا ہے جیسا کہ ان میں جگہ جگہ اس سے

پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۳

متعلق مواد ملتا ہے۔ بلکہ اس موضوع پر مستقل کتابیں سپرد قلم کی گئی ہیں۔

قوانین ادویہ کے انضباط میں اطباء نے جس ماہرانہ بصیرت سے کام لیا ہے وہ ان کے ادویاتی ذوق، کمال شغف اور وسعت ذہن کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے کی اہم کتابوں میں مثلاً ایک کتاب الشامل کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ محمد بن زکریا رازی کے نام اس کا انتساب اگرچہ محل نظر ہے لیکن اپنے مواد کی بناء پر ہمارے نقطہ نظر سے یہ ایک نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس کے درج ذیل عنوانات کے ذریعہ قوانین ادویہ کے موضوع کی وسعت واہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کتاب جزء نظری اور جزء عملی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ جزء نظری چار اجزاء پر مشتمل ہے۔ جز اول فی قوانین الادویۃ۔ جزء ثانی فی احکام الادویۃ المفردۃ مفصلا بحسب دوا۔ جز ثالث فی قوانین علم الادویۃ المرکبۃ۔ جز رابع فی احکام الادویۃ المرکبۃ مفصلا بحسب دوا۔

ان میں پھر جزء اول چار کتابوں پر مشتمل ہے۔ کتاب الاول فی احکام الادویۃ المعدنیۃ۔ کتاب الثانی فی احکام الادویۃ النباتیۃ بالقول الکلی۔ کتاب الثالث فی احکام الادویۃ الحیوانیۃ و اقسامہا بالقول الکلی۔ کتاب الرابع فی احکام الادویۃ المفردۃ علی الاطلاق۔

کتاب الرابع میں چار تعلیمات ہیں۔ تعلیم اول فی امزجۃ الادویۃ وفی تحقیق الکلام فی احکامہا وجہ الاستدلال علیہا۔ تعلیم ثانی فی افعال الادویۃ المفردۃ بالقوی التابعۃ لکیفیاتہا وصورہا (اس میں ایک مقدمہ اور دو جملے ہیں۔ مقدمہ فی صفات الادویۃ وافعالہا۔ جملہ اولی فی اوصاف الادویۃ وما یحدث فی بدن الانسان تلک الاوصاف۔ جملہ ثانیہ فی تحقیق الکلام فی کل واحد من افعال الادویۃ) تعلیم ثالث فی احکام الادویۃ المفردۃ بما یعرض بہا من خارج۔ تعلیم رابع فی اختیار الادویۃ التقاطہا وادخارہا۔

جزء ثانی سے ادویہ مفردہ کا علیحدہ علیحدہ تفصیلی بیان شروع ہوتا ہے۔ کتاب الشامل کا نامکمل خطی نسخہ کتاب خانہ پزشکی تہران میں محفوظ ہے۔

اس موضوع کی دوسری کتابوں میں مثلاً ثابت بن قرۃ کی دو کتابیں اصول

الادویۃ المفردۃ لجالینوس اور کتاب اجناس الادویۃ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مفردات کی بیشتر ضخیم کتابوں کی ابتدا قواعد وکلیات ادویہ سے کی گئی ہے جن بیش قدر کتابوں میں قوانین ادویہ کی تفصیلی بحث ملتی ہے ان میں داؤد انطاکی کا تذکرہ اولوالالباب متاخرین عرب اطباء کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا پہلا باب کلیات ادویہ (فی کلیات ہذا العلم والمدخل الیہ) اور دوسرا باب قوانین ادویہ مفردہ ومرکبہ (فی القوانین الجامعۃ لاحوال المفردات والمرکبات) سے متعلق ہے۔ اس کے بعد تیسرے باب سے مفردات کا بیان شروع ہوتا ہے۔

طب یونانی کے نصاب میں کلیات ادویہ مستقل مضمون کی حیثیت سے شامل ہے۔ علم الادویہ کے عربی، فارسی اور اردو ذخیرے میں اس موضوع کی معلومات بکھری ہوئی ہیں۔ مفردات ومرکبات کے بیان سے پہلے ان قوانین کے مطالعہ سے طلبہ کی ذہنی نشوونما اور تیاری میں مدد ملتی ہے اور علم الادویہ کی بنیادیں جس مرتب اور مربوط شکل میں یونانی نظام کے مبادیات سے جڑی ہوئی ہیں اس کا شعور انہیں حاصل ہوتا ہے۔ اخلاط و مواد پر ادویہ کی اثراندازی، نوعیت عمل اور مزاج واخلاط سے ان کے رشتے کو سمجھے بغیر یونانی علم الادویہ کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ادویہ کے افعال کلیہ مثلاً رادع، منضج، محلل، مرخی، قاطع، جاذب وغیرہ کا ایک پس منظر ہے اور طب یونانی کے بنیادی نظریات سے وہ پوری طرح ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ یہ محض "اصطلاحیں" نہیں ہیں جیسا کہ ناقص طور پر مضمون کے درس کے دوران پڑھایا جاتا ہے۔ اس کم فہمی کے نتیجے میں نہ معالجات سے ان کا کوئی رشتہ محسوس کیا جاتا ہے اور نہ ان کی کوئی علاجی اہمیت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ حالانکہ ان افعال کلیہ کے مختلف امراض اور نظام ہائے بدن پر اطلاق اور اس سے اصول علاج کے تعین، انتخاب دوا اور ترتیب نسخہ میں جو رہنمائی ملتی ہے، اس کا علم ایک طالب علم کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ مسکنات سے کن مختلف امراض میں کام لیا جاسکتا ہے یا محلل دوائیں کس نوع کے امراض میں استعمال کی جاسکتی ہیں یا منضج کے مواقع

استعمال کیا ہیں۔ افعال ادویہ کی یہ دراصل ایک کلی تقسیم ہے۔ جس کے ذریعہ پھر ایک ایک مرض میں اس کے اثر اور افادیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اگر یہ امر پوری اہمیت کے ساتھ پیش نظر رہے تو علم الادویہ سے منافعائی، ماہیت مرضی اور معالجاتی رشتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور یونانی نظام ادویہ جن بنیادوں پر قائم ہے اور ان کا یونانی نظام طب سے جو گہرا تعلق ہے اس کے ادراک میں دیر نہیں لگتی۔

علم الادویہ کا نصاب مفردات، مرکبات اور صیدلہ و تکلیس کے ساتھ کلیات ادویہ پر مشتمل ہے۔ کلیات ادویہ کی کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے طبیہ کالجوں میں اس مضمون کی تعلیم بذریعہ امالی رائج ہے۔ شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے سنٹرل کونسل آف میڈیسن کے نصاب کے مطابق علم الادویہ کی کتابوں کی ترتیب واشاعت کا جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے، "قوانین الادویہ" کے نام سے یہ کتاب اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ اس سے قبل شعبہ کی جانب سے مرکبات اور صیدلہ پر دو کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ شعبہ کے فاضل استاد حکیم سید ایوب علی نے اس کتاب میں موضوع متعلقہ پر روایتی طور پر نہیں لکھا ہے۔ انہوں نے تحقیق و تفحص کے ساتھ بعض عنوانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سے ان کی بالغ نظری اور شعور فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذوالخاصہ، صورت نوعیہ، مزاج، شناخت اور نئی دواؤں کی دریافت، جیسے موضوعات پر انہوں نے قدیم مباحث کے ساتھ جدید تعبیر پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ امید ہے کہ علم الادویہ کے ذخیرے میں اسے ایک اضافہ کا کام سمجھا جائے گا۔

۲۰/ مارچ ۱۹۸۱ء

OO

تقدمہ کنزالادویہ

علم الادویہ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر علماء طب نے اس مضمون سے جس غیر معمولی شغف کا اظہار کیا اس نے نہ صرف ادویہ کی تلاش و تحقیق کے کام کو آگے بڑھایا اور بڑی تعداد میں نباتات، حیوانات اور معدنیات کے خواص علم میں آئے بلکہ اس پر بکثرت کتابیں تصنیف کی گئیں اور مختلف ملکوں اور قوموں کی تجربہ شدہ ادویہ کے اوصاف ضبط تحریر میں لائے گئے۔

یونان میں اس موضوع پر اس قدر کام کیا جاچکا تھا کہ مخطوطات کی دستیابی کی مشکل کے باوجود جالینوس کی نظر سے علم الادویہ کی چودہ کتابیں گزر چکی تھیں۔ جالینوس کے اس بیان کی روشنی میں یہ اندازہ آسان ہے کہ اس تعداد سے کہیں زیادہ کتابیں تصنیف پاچکی ہوں گی۔ یونانیوں کے نمائندہ مصنف دیسقوریدوس (۷۰ء) کی مصور شاہکار کتاب الحشائش میں ۶۰۰ دوائیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کی یہ کتاب مفردات طب سے تعلق رکھنے والے بعد کے تمام اطباء کیلئے ایک مرجع اساس کا کام دیتی رہی اور جالینوس سے لے کر ابن بیطار اور داؤد انطاکی تک اسے بطور ماخذ استعمال کرتے رہے۔ اور ایک سرب گیان اور حکم انداز کی حیثیت سے اسے تسلیم کیا جاتا رہا۔ جالینوس (۱۲۹۔۲۰۱ء) کی کتاب الادویۃ المفردۃ پیش نظر نہیں ہے، اس کے ذریعہ مزید دواؤں کا اضافہ محسوس کئے جانے کے لائق ہے۔ دیسقوریدوس سے قبل بقراط (۴۶۰ ق م) کے عہد تک یونان میں ۲۳۶ سے زیادہ دوائیں علم میں نہیں آئی تھیں۔ دیگر ماہرین کے علاوہ ارسطو (۳۲۲۔۳۸۴ ق م) اور پھر اس کے شاگرد ثاوفرسطس (۲۷۰۔۳۸۰۔ ق م) کی خصوصی کوششوں کے نتیجہ میں اس تعداد میں اضافہ ہوا۔ ثاوفرسطس کی کتاب

پبلی کیشن ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۵

اسباب النبات ۴۵۵ دواؤں کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ قدیم ہندوستان میں بھی صورت حال اس سے زیادہ مختلف نہیں تھی چرک میں ۵۰۰ اور سشرت میں ۷۶۰ دواؤں کا ذکر ہے۔

ادویہ سے یہ دلچسپی عربوں کے ہاں عروج پر پہنچی۔ عرب دنیا بہت وسیع تھی مغرب میں ساحل اوقیانوس، مشرق میں سندھ، جنوب میں بحر ہند اور شمال میں قفقاز تک اس کی حدیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یونانیوں کے لئے جنہیں صرف یورپ کے ساحلی مقامات اور آس پاس اُگنے والی جڑی بوٹیوں پر تجربے کے مواقع حاصل ہوئے۔ عرب ماہرین کو اس سے کہیں زیادہ وسیع علاقہ میں نباتات پر کام کا موقع ملا اور مختلف ممالک کی پیداوار اور مختلف اقوام کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ادویہ کے سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ نویں صدی سے تیرہویں صدی تک کے درمیانی زمانہ میں علم الادویہ کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کام وہاں انجام پایا اس نے اس علم کے معیار کو بہت بلند کیا اور بعد کی صدیوں پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور آج بھی علم الادویہ کا یہ نظام برصغیر میں رائج ہے۔

عربی علم الادویہ قدیم پیش رو اطباء کے علم سے نہ صرف تعداد کی زیادتی، شناخت، تفصیلی بیان، طبی استعمال اور جائے پیدائش کے لحاظ سے برتری و فوقیت رکھتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علم نباتات، علم حیوانات اور علم معدنیات سے نہایت قابل لحاظ رشتہ قائم کر کے عرب اطباء نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ علمی اعتبار سے بے حد وقیع ہے۔ اس تعلق سے اس علم کو ترقی کا ایک نیا میدان ملا اور اس کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی۔ علم الادویہ کے میدان میں ان کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ بھی رہا کہ ان کے علمی ذوق و جستجو کی بناء پر توضیحی بیانات اور تقسیم و درجہ بندی نے بڑی وسعت اختیار کی۔ عرب علمی معلومات کو بہت بہتر طور پر منظم کرنے والے تھے۔ ان کی یہ صلاحیت علم الادویہ کی تصانیف میں بہت نمایاں ہے۔ ان میں جو ترتیب و تنظیم پائی جاتی ہے اس نے نہ صرف ادویہ کا بہترین خاکہ کھینچ کر رکھ دیا ہے بلکہ اس علم کے مطالعہ

تحقیق کی راہوں کو بھی آسان بنایا ہے۔

بارہویں صدی تک عرب ماہرین ادویہ میں ابن جلجل (پیدائش ۳۳۲ھ/ ۹۴۳ء) ابن سمجون (وفات ۳۹۲ھ/۱۰۰۱ء کے قریب) ابن الجزار (وفات ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء) ماسویہ المردینی (وفات ۱۰۱۵ء) ابن وافد (۱۰۵۴۔۹۹۷) غافقی (وفات ۱۱۵۶ء) ابن رومیہ (وفات ۱۲۳۹ء) رشید الدین صوری (۱۲۴۱۔۱۱۷۷ء) یوسف بن عمر ترکمانی غسانی (وفات ۵۔۶۹۰ھ/ ۱۲۹۴ء) جیسی نامور شخصیتیں گزریں، جن کی تصانیف کا مطالعہ ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے اور جن کی طرف ابھی بہت کم التفات کیا گیا ہے۔ ابن بیطار (۱۲۴۸۔۱۱۹۷ء) جس کی کتاب الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیۃ کا شمار اہم ترین فنی کتابوں میں ہے، علم الادویہ کی عظیم روایات کا وارث و ترجمان ہے۔ وہ ان تحقیقی و فنی قدروں کا معیار شناس بھی ہے جن کی معیار شناسی خود اس کی تحقیق و فن کا طرہ امتیاز ہے۔

ابن بیطار کے ساتھ ہم خلافت مغربی کے آخری طبی مصنف تک پہنچ جاتے ہیں، جس کے علمی تاثر طب عربی میں طویل عرصہ تک باقی رہے اور جس نے قرون وسطی میں یورپ کی طبی تفکیر میں نمایاں اثر مرتب کیا۔ اس نے ڈیڑھ سو قدیم مصنفین کی قیمتی معلومات اپنے ذاتی تجربات و اضافات کے ساتھ ایک خاص حسن و سلیقہ سے پیش کی ہیں۔ یہ حوالے اس موضوع پر اس کے مطالعہ کی وسعت اور ژرف نگاہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس نے ۱۴۰۰ مفردات کے افعال و خواص کا ذکر کیا ہے جب کہ اسلامی عہد کے اس موضوع کے ابتدائی فارسی مصنف ابو منصور موفق ہراتی کی کتاب الابنیۃ عن حقائق الادویۃ (تالیف تقریباً ۵۹۰ء) میں صرف ۵۸۵ دواؤں کا بیان شامل ہے۔

علم الادویہ کی یونانی کتابوں کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے تھی۔ عام عرب مصنفین کا بھی یہی پسندیدہ طرز رہا۔ لیکن علمی وافادی نقطہ نظر سے اس ترتیب کے مقابلہ میں زیادہ موزوں خیال کرتے ہوئے انہوں نے اعضاء کے لحاظ سے ترتیب قائم

کی۔اس سلسلہ میں یوسف بن اسماعیل المعروف ابن الکبیر کی کتاب مالایسع الطبیب جہلہ (تالیف ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس انداز کی ایک زیادہ قدیم کتاب ابوالصلت امیہ بن عبدالعزیز (وفات محرم ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) کی الادویۃ المفردۃ علی ترتیب الاعضاء المتشابۃ الاجزاء والآلیۃ ہے۔ جس میں اعضاء مفردہ و مرکبہ کی ترتیب پر مفرد دواؤں کا اندراج ہے۔ ابوسعید بن ابراہیم المغربی العلائی جو تقویم کے طرز پر اپنی کتاب الادویۃ المنجمہ (کتاب الفتح فی المداوی) کی وجہ سے مشہور ہے وہ کنزالحکماء (کتاب الالواح) کا بھی مصنف ہے۔ اس میں اعضاء کے لحاظ سے ادویہ مفردہ کا بیان ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں اس کا مخطوطہ محفوظ ہے۔ اسی لائبریری میں ایک رسالہ فی الادویۃ علی ترتیب العلل بھی ہماری خاص دلچسپی کا باعث ہے۔

ابن سینا نے ۷۱۹ دواؤں پر مشتمل مفردات کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق قائم کر کے محض یونانی روایت پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ افعال و خواص کے بیان میں ایک نئی راہ اختیار کرتے ہوئے انہیں مختلف جسمانی اعضاء وامراض کے لحاظ سے درج کیا ہے۔ مثلاً دوا کا اثر نظام تنفس پر، نظام ہضم پر، اعضاء بول پر وغیرہ یعنی ترتیب ادویہ حروف تہجی کے لحاظ سے مگر ان کے افعال و خواص کا بیان اعضاء وامراض کے اعتبار سے ہے۔

ادویہ کی تقسیم بلحاظ افعال و تاثیر مثلاً مسہل، ملین، عاصر، کاسر ریاح، مخرج دیدان، مدر بول وغیرہ اسی طرح بلحاظ ذرائع حصول مثلاً ادویہ نباتیہ، ادویہ حیوانیہ اور ادویہ معدنیہ ان کے ماخذ کے لحاظ بھی قائم کی گئی ہے۔

ادویہ سے متعلق تصانیف کی ایک قسم جدول و ملخصات ہے۔ علم کے بہترین مجموعہ کے طور پر عربوں نے اپنی معلومات کے جدول تیار کئے۔ چونکہ مواد کی مقدار میں اس تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا کہ اس سب کو یاد رکھنا مشکل تھا۔ اس لئے بعض چیزوں کا بروقت پیش نظر رکھنا ضروری سمجھا گیا اور ایسی کتابیں تصنیف کی گئیں جن میں ایک صفحہ میں مجمل طور پر دوا سے متعلق تمام ضروری معلومات درج کی گئی

ہیں۔ اس نوعیت کی تصانیف کی ایک اعلیٰ مثال ابن بکلارش (۱۱۰۶ء کا شہرت یافتہ) کی کتاب المستعینی ہے۔ المغربی کی کتاب الفتح فی المداوی کے علاوہ کمال الدین ابوالفضل حبیش بن ابراہیم اللطفلسی (وفات تقریباً ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء) کی تقویم الادویۃ، ابن جزلہ بغدادی کی تقویم الابدان فی تدبیر الانسان، ابن بطلان کی تقویم الصحۃ فی القویٰ الاغذیہ ودفع المضارہ، محمد بن علی اسفرائنی (وفات ۹۵۰ھ / ۱۵۴۵ء کے بعد) کی تقویم الادویہ وغیرہ ہیں۔

عربی علم الادویہ میں عام طور پر مختلف زبانوں کے مترادف نام تحریر کئے گئے ہیں۔ ہم معنی ناموں کی یہ فہرست اس اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے یونانی، سریانی، لاطینی، بربری، فارسی، ہندی اور دوسری زبانوں کی مترادف اصطلاحات سامنے آتی ہیں جو بالخصوص جغرافیائی لحاظ اور ان کی جائے پیدائش سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بعد دوا کی ماہیت، مزاج، خواص اور استعمال کی تفصیل درج ہے۔

علم الادویہ کی مستقل تصانیف کے علاوہ عام طبی کتابوں کا ایک خاصہ بڑا حصہ ادویہ کے لئے مخصوص ہے اور تقریباً تمام بڑی کتابوں میں علم الادویہ کے ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ اس علم کے مطالعہ میں ان ابواب سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں مثلاً علی بن ربن طبری کی فردوس الحکمۃ، علی بن عباس کی کامل الصناعۃ، ابن سینا کے قانون، امین الدولہ کی المنہج الواضح فی الطب اور سید اسماعیل جرجانی کی ذخیرہ خوارزم شاہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح معالجات کی کتابوں میں امراض کی ماہیت، اسباب و علامات کے ساتھ علاج کے ذیل میں ہر مرض سے متعلق جس اہمیت کے ساتھ دواؤں کو بیان کیا گیا ہے وہ مفردات و مرکبات دونوں کے سلسلہ میں ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ "دویہ کے مطالعہ میں معالجات کی یہ کتابیں ہمارے موضوع کے لحاظ سے بے حد وقیع ہیں۔ بلحاظ ترتیب امراض ان سے ادویہ کے بارے میں بہت مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں علم الادویہ پر متعدد قابل قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں مخزن

الادویہ حکیم محمد حسین، تالیف شریفی حکیم محمد شریف خاں، مفردات ہندی حکیم شرف الدین، یادگار رضائی حکیم رضا علی خاں، مفردات ہندی حکیم جزی ڈسلوا، محیط اعظم حکیم اعظم خاں، بستان المفردات حکیم عبدالحکیم، خزینۃ الادویہ حکیم نجم الغنی، مفردات عزیزی حکیم عبدالحلیم کا شمار اہم متداول کتابوں میں ہے۔ لیکن ان کتابوں میں بالخصوص شناخت وماہیت کے تعلق سے بڑی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ جدید تقاضوں کے مطابق علم الادویہ پر تحقیقی کام کی شدید ضرورت ہے۔ ادویہ کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ کام تنہا ایک آدمی کیلئے آسان نہیں ہے۔ تحقیق اور اعلیٰ معیار کے لحاظ کے ساتھ ایک وسیع منصوبہ کے تحت متعدد جلدوں میں اس کام کی ادائیگی ممکن ہو سکے گی۔

زیر نظر کتاب کنزالمفردات کا تعلق علم الادویہ کے نصاب سے ہے جسے شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فاضل استاد حکیم محمد رفیق الدین نے محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ نصابی ادویہ کے علاوہ ہندوستان میں پائی جانے والی مشہور نباتات کا بھی ذکر ہے۔ ماہیت کے ضمن میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ایک نبات کے مختلف اجزاء مثلاً پھل، پتی، شاخ، جڑ، تخم، گوند وغیرہ کا بیان ایک ہی مقام پر کیا جائے تاکہ بلحاظ ردیف تلاش میں دشواری نہ ہو۔ مؤلف نے قدیم تصنیفات کے علاوہ جدید کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔ ادویہ کے نباتی نام اور ان کے خاندان کے تذکرہ کے ساتھ دواؤں کا کیمیاوی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ تقریباً ۶۰۰ ادویہ پر مشتمل اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ماہیت کا بیان زیادہ تفصیل سے ہے اور افعال کے سلسلہ میں باحتیاط صرف مسلمہ خواص پر اکتفا کیا گیا ہے۔ انڈر گریجویٹ کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ کے طلبہ اور دیگر شائقین علم الادویہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ اس کامیاب کوشش کے لئے مؤلف مستحق ستائش ہیں۔ میں نے اپنی صدارت شعبہ کے پہلے دور میں علم الادویہ کی نصابی کتب کی تیاری و اشاعت کا ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس اشاعتی سلسلہ کے تحت منہاج

الصیدلہ، کتاب المرکبات اور قوانین ادویہ کے بعد یہ چوتھی کتاب ہے جو میری صدارت کے دوسرے دور میں اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ علم الادویہ کی نصابی ضرورتیں ان کتابوں کے ذریعہ پوری ہو سکیں گی اور شعبہ کے اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

۱۲ر مئی ۱۹۸۵ء

OO

تقدمہ گوسوامی بیان الادویہ حصہ دوم

یونانی نظام علاج میں مفرد ادویہ کو ہمیشہ اصل حیثیت حاصل رہی۔ مفردات کی تلاش و تحقیق ان کے خواص کی دریافت، ماہیت و شناخت، مختلف امراض میں ان کی افادیت اور استعمال کے طریقوں پر طبی ماہرین نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں ہزاروں جڑی بوٹیوں کی دوائی منفعتیں انسان کے علم میں آئیں اور علم الادویہ نے طب کے اہم ترین موضوع کی شکل اختیار کی۔ یونانی عہد سے موجودہ زمانہ تک اس موضوع پر کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں ادویہ کی عام اور تفصیلی معلومات پر مشتمل ہیں جن میں طلبہ کے ذہنی معیار اور درسی ضرورتوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں نئے تقاضوں کے تحت طب کے دوسرے موضوعات پر جہاں درسی کتابیں مرتب کی گئیں، وہاں علم الادویہ کی بھی بعض معیاری کتابیں سامنے آئیں۔ ان کتابوں کو ادویہ کی تحدید کے ساتھ خاص نصابی رعایتوں کو ملحوظ رکھ کر مرتب کیا گیا تھا ان میں بعض کتابیں کافی مقبول ہوئیں اور ان کی متعدد اشاعتیں نکلیں۔ لیکن ادھر چند سال سے کسی کتاب کے اشاعت پذیر نہ ہونے کی وجہ سے علم الادویہ کی کتابوں کی دستیابی ایک بڑا مشکل مسئلہ بن گئی تھی۔

میرے عزیز دوست حکیم رام لبھایا طلبہ ادویۂ مفردہ کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انہوں نے نصابی ضرورت کے مطابق گوسوامی بیان الادویہ کے نام سے دو جلدوں میں اس موضوع پر ایک اچھی کتاب مرتب کی ہے۔ حکیم صاحب برسوں

مطبوعہ کوہ نور پریس، دہلی ۱۹۷۸

سے جامعہ طبیہ دہلی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ علم الادویہ کے تعلق سے میں ان کی دو خوبیوں کا خاص طور پر معترف ہوں۔ ایک دواؤں کی شناخت سے ان کی دلچسپی اور مختلف مقامات میں پہنچ کر دوائی پودوں کا معائنہ دوسرے دواسازی سے عملی واقفیت، کشتہ سازی میں خصوصیت سے وہ اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ نہ صرف عاملین طب بلکہ معلمین طب میں بھی یہ دونوں چیزیں عام طور پر مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ شناخت وماہیت ادویہ کے بارے میں قدیم مصنفین کے ہاں جو غلطیاں ملتی ہیں اگر ان کی نشاندہی اور اصلاح کے انداز پر حکیم صاحب کچھ لکھتے تو یہ ایک نہایت مفید اور کار آمد بات ہوتی ۔ عام روایتی طریقے کے مطابق کتاب میں مترادف نام، ماہیت، مزاج، افعال واستعمال، نفع خاص، مقدار خوراک اور مرکبات درج کئے گئے ہیں۔ مضر اور مصلح سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ نباتاتی نام اور کیمیاوی اجزاء کا اضافہ قابل قدر ہے۔

اس کامیاب کوشش پر میں حکیم صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کی نصابی ضرورت کو پورا کرے گی اور مفردات سے عام دلچسپی رکھنے والے اس سے استفادہ کریں گے۔ کسی اضافت کے بغیر بیان الادویہ بہت اچھا نام ہے۔ میری تجویز کہ اشاعت ثانی کے موقع پر نام کے اس حسن کا خیال رکھا جائے، اس ذاتی مخلصانہ تعلق پر مبنی ہے جو اس کے مرتب اور اس ہیچمداں کے درمیان برسوں سے قائم ہے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۷۷ء

OO

تقدمہ مفردات طب

طب یونانی میں مفرد دوا کے استعمال کو جس قدر اہمیت دی گئی ہے جدید طب کے حاملین شاید اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ ادویہ مفردہ کی شناخت، ماہیت، مزاج، خواص مقدار خوراک، بدل، مصلح، مضر اور طریقہ استعمال کے مطالعہ پر ماہرین طب یونانی کی جو بے پناہ کاوشیں صرف ہوئی ہیں اور جس شوق، باریک بینی اور جذبہ تحقیق سے انہوں نے جڑی بوٹیوں، حیوانات اور معدنی اشیاء میں چھپے دوائی خواص کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے اظہار کے لیے وہ بے شمار قیمتی ذخیرہ کافی ہے جو انہوں نے یادگار چھوڑا ہے۔ نامعلوم دواؤں کے علاوہ معلوم دواؤں کے نئے خواص کی دریافت آج بھی یونانی طبیبوں کا پسندیدہ تحقیقی مشغلہ ہے۔ ان کے نت نئے تجارب سے آئے دن نئی تاثیرات سامنے آتی رہی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کثیر التعداد کتابوں کی تصنیف کے باوجود بہت کچھ مواد ضبط تحریر میں نہیں آیا ہے۔

مفرد دوا کے استعمال پر عرب اطبا نے خاص طور پر زور دیا ہے اور حتی الامکان مرکب دوا سے احتراز کی ہدایت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ جب تک مفرد دوا سے کام نکل سکے، مرکب دوا ہرگز نہ استعمال کی جائے۔ اور اگر مفرد کے بجائے مرکب کا استعمال ضروری ہو تو ایسا مرکب اختیار کیا جائے جو کم سے کم مفردات پر مشتمل ہو۔

اس نظریہ کی اشاعت میں ابن وافد (۱۰۷۴۔۹۹۷ء) اور ابن زہر (۱۱۶۲۔۱۰۹۲ء) کا نام سر فہرست ہے۔ محمد بن زکریا رازی (وفات ۹۲۵ء) نے ایک مستقل رسالہ فی اثقال الادویہ کے نام سے تحریر کرتے ہوئے اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے کہ مرکب دواؤں کو زیادہ مفرد ادویہ سے نہ ترکیب دیا جائے اور جس قدر ممکن ہو مفرد ادویہ سے کام لینے کی کوشش کی جائے۔

عربوں سے پہلے یونانیوں کے ہاں زیادہ مفرد دواؤں کے حامل مرکبات کا رواج تھا۔ اوصاف ادویہ کثیرہ کے اس طریقہ کو تجربی اسکول Emprical School کے ذریعہ خاص کر فروغ ہوا۔ یہ اسکول ہیرو فیلوس کے شاگرد فلیناس Philinos (۲۸۰ ق م) کے زیر اثر اسکندریہ میں قائم ہوا تھا۔ اسے بعد میں ایک گرامی منزلت طبیب سیراپین (۲۲۰ ق م) نے اوج رفعت تک پہنچایا۔ اسکندریہ کے اس اسکول کی وجہ سے رومی عہد میں ادویہ کثیرہ کا طریقہ بہت مروج رہا۔ چنانچہ وہ دوائیں جو تریاق اور فادزہر کے نام سے تیار کی گئی تھیں، ان میں چالیس سے لے کر ساٹھ تک دوائیں داخل کی جاتی تھیں۔ اس عہد کے بعض مرکبات جو آج بھی ہمارے درمیان معروف ہیں مثلاً جوارش جالینوس، ان کے نسخوں میں اس عام رجحان کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

مرکب دوا کے مقابلہ میں مفرد دوا کی ترجیح پر جو وجوہ پیش کیے گئے ہیں وہ علم و تحقیق اور رہنما اصول کے لحاظ سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے بعض ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ مفرد دوا بدن میں جس قدر مکمل اور مفید اثر کر سکتی ہے اس قدر کوئی مرکب دوا طبیعت کے انتشار کے باعث نہیں کر سکتی۔ دوسرے الفاظ میں طبیعت اور بدنی قوتوں کے لیے مرکب کے مقابلہ میں مفرد دوا میں اس کی سادگی کی وجہ سے اثر کرنا اور اس کی خاصیت کو بروئے کار لانا آسان ہوتا ہے۔

۲۔ مرکب دوا کی مقدار خوراک کو اگر اس میں شامل مفردات پر تقسیم کیا جائے تو ان میں سے ایک مفرد بھی اپنی کامل مقدار کو نہیں پہنچے گی۔ اس لیے ان کے وہ منافع واثرات حاصل نہیں ہوں گے جو انفرادی حالت میں ان کی پوری مقدار خوراک کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

۳۔ مفرد دوا کے استعمال کی صورت میں اس کے اثر کے متعلق فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن مرکب کی صورت میں نفع و نقصان سے متعلق کسی ایک دوا کے تعلق سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

۴۔ مرکب کی صورت میں مفرد دوا کے متعینہ فعل میں کمی و بیشی پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایک دوسری چیز یہ بھی رہتی ہے کہ اس میں مرض کی نوعیت یا کسی دیگر عارضہ کی رعایت سے ترمیم مشکل ہوتی ہے۔ ترکیب یافتہ دوا کے مقابلہ میں اسی لیے مفردات کا کھلا نسخہ مفید ہوتا ہے (اگرچہ وہ بھی متعدد مفردات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک مرکب صورت ہے) جس میں حالات کی مناسبت سے حذف و اضافہ اختیار میں ہوتا ہے۔

بعض رعایتیں اور موانعات جن کے پیش نظر مرکب دوا کے استعمال کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ان کا بھی بطور مثال یہاں ذکر ضروری ہوگا۔

۱۔ کوئی دوا اتنی حاد اور تیز ہو کہ اس کی اصلاح کے لیے دوسری دوا شامل کی جائے۔ جیسے افیون کے ساتھ جند بیدستر یا سقمونیا کے ساتھ کتیرا۔

۲۔ کسی دوا کی بو اس قدر ناگوار ہو کہ اس کے ساتھ کوئی خوشبودار چیز اضافہ کرنی پڑے۔ جیسے حلتیت کے ساتھ زعفران۔

۳۔ کسی دوا کا ذائقہ تلخ اور کڑوا ہو، اس کے ساتھ کوئی شیریں دوا ملانا ضروری سمجھا جائے۔

۴۔ کسی دوا کی قوت مطلوبہ غرض سے کم ہو تو اس کے فعل واثر میں اضافہ کے لیے کوئی دوا شریک کی جائے۔ جیسے تربد کے ساتھ فعل اسہال میں مدد کے لیے زنجبیل بڑھائی جاتی ہے۔

۵۔ کسی دوا کی قوت مطلوبہ غرض سے زیادہ ہو تو اسے کمزور کرنے کے لیے کوئی دوا اس کے ساتھ شامل کی جائے۔ جیسے شافہ میں زنگار کے ساتھ صمغ عربی ملاتے ہیں۔

۶۔ کسی دوا میں جلدی نفوذ اور سرایت کرنے کی قوت زیادہ ہو، لیکن اس کو کسی عضو ماؤف میں زیادہ دیر ٹھہرانا مقصود ہو تو اس کے ساتھ کسی ایسی دوا کا اضافہ کیا جاتا ہے جو اس کے فعل نفوذ میں رکاوٹ پیدا کر کے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کا

موقع دے۔ جیسے روغن بلسان کے ساتھ موم خالص ملایا جاتا ہے۔

۷۔ کسی دیر میں نفوذ کرنے والی دوا کو جلدی نفوذ کرانے کے لیے اس کے ساتھ کوئی دوا ملائی جاتی ہے۔ مثلاً مرض کی باری کو روکنے کے لیے کوئی دوا استعمال کرنی ہو اور باری کا وقت قریب آجائے تو کوئی ایسی چیز ملاتے ہیں جو اس کو جلدی نفوذ کرانے میں مدد دے۔ چنانچہ ایسے موقع پر رقیق شراب ملائی جاتی ہے۔ بعض دور کے مقامات تک پہنچانے کے لیے دوا کو سریع النفوذ بنانے کے واسطے کوئی دوا شامل کرتے ہیں۔

۸۔ وہ دوائیں جو بعض اعضاء کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں، انہیں اس مخصوص تعلق کی وجہ سے اضافہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً قلب کی رعایت سے کافور کے ساتھ زعفران ملایا جاتا ہے۔

۹۔ اگر کوئی مرض بہت شدید اور مستحکم ہو تو اس کی شدت و استحکام کی وجہ سے مفرد کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ مرض کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جاسکے۔ اسی طرح عوارضات زیادہ ہونے کی صورت میں بھی دوا کو ترکیب دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مفرد ادویہ کی اہمیت اور علاج بالمفرد نے جہاں ادویہ مفردہ کے مطالعہ کو فروغ دیا، وہاں آئندہ کے لیے مفرد دوا پر تحقیق کے مسئلہ کو بھی بہت آسان بنایا۔ یہ نظریہ جدید علمی اصول تحقیق کے عین مطابق ہے اور اس کی بنیاد پر ادویہ کے سلسلے میں تحقیقی کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

یونانی علم الادویہ کے مطالعہ پر بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔ ابتدائی عہد کی بہت سی کتابیں ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اور جو کتابیں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر متون کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ اس غیر مطبوعہ ذخیرہ کی جو مراکش سے ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے، ابھی تک مکمل فہرست بھی نہیں تیار کی جاسکی ہے۔

نویں صدی سے پندرہویں صدی تک کا زمانہ یونانی طب و علم الادویہ کا عہد زریں ہے۔ ان علوم میں جن میں مسلمانوں کے اضافات کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ علم

الادویہ خاص طور پر شامل ہے۔ اسی طرح یہ وہ طبی مضمون ہے، جس کی جگہ سب سے آخر میں جدید سائنس نے لی۔ مغربی یورپ میں اس کی موثر حیثیت انیسویں صدی کی ابتدا تک قائم رہی اور وہاں تقریباً ایک ہزار برس اس کا اقتدار رہا۔ جدید کیمسٹری کے ظہور کے باوجود اس کا وجود اور جڑی بوٹیوں اور نباتی ادویہ کے مطالعہ سے دنیا کی دلچسپی ان میں مخفی طبی خواص کی افادیت کا کھلا اعتراف ہے۔

موجودہ زمانہ میں یونانی طب و علم الادویہ سے طبی محققین کے علاوہ سائنسی مورخین کی دلچسپی کی متعدد وجوہات میں ایک وجہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا نے اپنے عہد زریں اور اس کے کچھ بعد کے زمانہ تک جن علوم کے مطالعہ و تحقیق میں امتیاز پیدا کیا ان میں طب و علم الادویہ کا بطور خاص شمار ہے۔ اور یہ وہ علم ہیں جو اس زمانہ کے یورپ میں تنزل کے آخری درجہ میں تھے۔ یہ عرب اطباء کا فیضان اور ان کی علمی اعانت تھی جس نے وہاں طبی سرگرمیوں کی بنیاد رکھی اور یورپ نشاۃ ثانیہ کے قابل ہو سکا۔ طب، علم الادویہ اور علم الکیمیا میں عرب اطبا نظریاتی و عملی دونوں حیثیتوں سے ان کی ترقی کے ذمہ دار ہیں۔

طب یونانی میں ادویہ کے مطالعہ کی طرف خصوصی توجہ کی وجہ سے یہ مضمون دوسرے موضوعات کے مقابلہ میں زیادہ مرکز تحقیق رہا ادویہ اور ان سے متعلق تصانیف کے مہتم بالشان ذخیرہ سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ ہندوستانی مصنفین نے اس سرمایہ میں بہت اضافہ کیا ہے اور نہایت بیش قدر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ریاض الادویہ حکیم یوسف بن محمد یوسف یوسفی، الفاظ الادویہ حکیم نور الدین شیرازی، خواص الادویہ حکیم نظام الدین احمد گیلانی، تکملہ ہندی شاہ اہل اللہ، مخزن الادویہ حکیم محمد حسین شیرازی، مفردات اسکندری حکیم اسکندر، مفردات ہندی حکیم شرف الدین سہاوری، مفردات ہندی حکیم جزی ڈسلوا، تالیف شریفی حکیم محمد شریف خاں، یادگار رضائی حکیم رضا علی خاں، بستان المفردات حکیم عبدالحکیم، تالیف احسانی حکیم احسان علی خاں، محیط اعظم حکیم محمد اعظم خاں، خزینۃ الادویہ حکیم نجم الغنی خاں، مفردات

عزیزی حکیم عبدالحلیم، عین الادویہ حکیم فیروز الدین، جامع لعقاقیر حکیم عبدالمجید عتیقی، تذکرہ عقاقیر حکیم محمد حسن قرشی، تعلیم الادویہ حکیم جلیل احمد انصاری، معلم الادویہ حکیم مسیح الزماں ندوی، گوسوامی بیان الادویہ حکیم رام لبھایا، کنز الادویہ حکیم محمد رفیق الدین، ادویہ مفردہ حکیم صفی الدین ان بہت سی کتابوں میں ہیں، جن کی تالیف یہاں عمل میں آئی ہے۔ ان میں سے موخر الذکر چند کتابیں طلبہ کی نصابی ضرورت کے خیال سے بھی لکھی گئی ہیں۔

ڈاکٹر مستحسن جعفری ریڈر شعبہ علم الادویہ جامعہ ہمدرد نئی دہلی کی کتاب مفردات طب اس سلسلہ کی ایک مفید کاوش ہے۔ اس میں نصاب کی قریب سو دوائیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے اور دوسرے باب میں علی الترتیب ۶۰۔۶۵ ادویہ حیوانیہ اور ادویہ معدنیہ پھر اس کے بعد الف کی تختی کی تقریباً ۴۰ نباتی دوائیں شامل ہیں۔ کتاب کی دوسری جلد باقی نباتی دواؤں پر مشتمل ہوگی۔

ابتدا میں ایک فہرست کے ذریعہ ادویہ کی درجہ بندی (Classification) بلحاظ اخلاط اور بلحاظ افعال و نظامہائے بدن پیش کی گئی ہے۔ طبی نام کے ساتھ مترادف انگریزی اور لاطینی (نباتی) نام اور خاندان کا اہتمام کیا ہے۔ ماہیت کے ذیل میں ادویہ کے ماخذ اور طبی کتابوں میں درج تفصیل کے ساتھ جدید معلومات کی روشنی میں ان کی ظاہری و طبعی خصوصیات Morphology بیان کی گئی ہیں۔ ادویہ معدنیہ کے مطالعہ میں معدنی اور کیمیاوی اسی طرح ادویہ حیوانیہ کے بیان میں علم حیوانات سے مدد لی گئی ہے اور صحیح اور سائنٹفک طور پر ان کا ماخذ درج کیا ہے۔ قدیم کتابوں میں ان کی ماہیت اور حقیقت کے تعلق سے بڑی غلطیاں اور متضاد بیانات ملتے ہیں۔ نباتی دواؤں کے تذکرہ میں پودے اور خصوصاً پودے کے جزء مستعمل کا تفصیلی بیان دیا گیا ہے۔ ماہیت کے بعد مزاج، افعال، استعمال، مقدار خوراک اور مخصوص مرکبات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر دوا کے آخر میں چند ایسی باتیں خصوصیت کے ساتھ درج کی ہیں، جو عام طور پر کتابوں میں نہیں ملتیں۔ مثلاً کہیں اطبا کے مشاہدات میں آنے والے ایسے

خواص جن کا طب یا ادویہ کی کتابوں میں تذکرہ نہیں ہے، اسی طرح کلینکل اور فارماکولوجیکل تحقیقات کی شمولیت اور مختلف محللات میں حاصل کئے گئے اکسٹریکٹ کے افعال بیان کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ آس، اخروٹ، اجوائن، ایرسا، ہیل کلاں وغیرہ کے ذکر میں ملتا ہے۔ ملاوٹ، نقل اور ماہیئت کے اختلافات کا تذکرہ اور سائنٹفک حوالوں کی روشنی میں دوا کی متنازعہ حیثیت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصی کیمیاوی اجزاء بھی پیش کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مستحسن جعفری تدریسی اور تحقیقی سرگرمیوں کے ساتھ شعبہ علم الادویہ کی نگرانی اور اسے ہمہ جہت ترقی دینے میں مصروف ہیں۔ ان کی صدارت میں اس شعبہ نے ایک امتیاز حاصل کیا ہے۔ ان کی شخصیت میں جو ایک پرجوش امنگ اور بلند حوصلگی ہے اور جس ذوق و شوق سے وہ علمی و فنی کاموں میں مصروف ہیں، مجھے امید ہے اس سے فن اور ادارہ کو فائدہ پہنچے گا اور ان سے مزید طبی خدمات انجام پائیں گے۔

۱۸ر مئی ۱۹۹۹ء

تقدمہ منہاج الصیدلہ

ترکیب ادویہ کے سلسلہ میں عرب اطباء نے جہاں نسخوں کے بہترین مجموعے اور بیش قدر قرابادین مرتب کیں۔ وہاں دواسازی کو عملی شکل اور اس کو ایک باقاعدہ فن قرار دینے میں انہوں نے اعلیٰ صلاحیتوں کا استعمال کیا۔

یونانی عہد میں صرف اجسام عضویہ پر ادویہ کا مطالعہ کیا گیا تھا۔ لیکن تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ ان کے اجزاء موثرہ، قویٰ اور درجات وغیرہ کے سلسلے میں کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکی تھی۔ عرب اطباء نے تحلیل و تجزیہ کا فن ایجاد کیا۔ ادویہ کی قوتیں اور ان کی تاثیرات دریافت کیں۔ خوشبودار چیزوں کی حقیقت اور ان کے اڑ جانے والے یا روغنی اجزاء کا سراغ لگایا۔ دواسازی میں کیمیاوی اعمال سے مدد لے کر کیمیکل فارمیسی کی بنیاد ڈالی اور فن دواسازی کو ترقی سے ہمکنار کیا۔ مورخین نے بڑی فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا ہے۔ چارلس ایل ڈنا نے ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "عرب تنکچروں کے موجود تھے۔ مربے معجون اور شربت اسی طرح سرجیکل استعمال کے لئے پلاسٹر اور مرہم بھی انہی کی ایجادات سے ہیں"۔ واقعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے انہی نے دواؤں اور جڑی بوٹیوں کو ترکیب و ترتیب دینے کا اصول وضع کیا اور عمل تقطیر، عمل تصعید، عمل ترشیح، عمل تبلور اور علم الکیمیا کے دوسرے اعمال کا دواسازی سے رشتہ قائم کیا۔ فرانسیسیوں نے فن دواسازی کی تاریخ پر جب توجہ کی تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ عرب ہی تھے جنہوں نے اس فن کی بنیادیں قائم اور استوار کی ہیں۔

تاریخ علم الادویہ و صیدلہ کے طالب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہنا چاہئے کہ قدیم مصر میں فن طب و کیمیا کی طرح قیمتی دھاتوں کی صنعت عمل دباغت، عطر سازی،

پبلی کیشن ڈیوژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۰

رنگ ریزی اور شیشہ گری میں بھی بڑی ترقی کی گئی تھی۔ ان فلزاتی فنون اور مختلف صنعتوں کے نتیجہ میں ادویہ کے سلسلہ میں انسان کے مطالعہ کو وسیع کرنے میں خاص طور پر مدد ملی ہے۔ ان موضوعات پر علمی یا تصنیفی و تالیفی حیثیت سے کوئی کام نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے یقینی طور پر یہ معلومات صنعت گروں اور کاریگروں کے شاگردی نظام کے ذریعہ خاص کر منتقل ہوئی ہیں۔ جس طرح مصریوں کے بارے میں ملتا ہے کہ ان کا علم الادویہ پورے طور پر وسیع اور ان کی کیمسٹری اور فارمیسی عملی صورت رکھتی تھی۔ اسی طرح بابل اور آسوریہ کے ان خشتی کتبوں سے جن کا تعلق طب سے ہے، اس زمانے میں مستعمل مفرد اور مرکب ادویہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں مرہم شیاف اور ضماد کے نسخے تحریر ہیں۔ مصر اور بابل کی ان طبی اور صنعتی ترقیات کا اثر عربی علم الکیمیا اور دواسازی پر نمایاں ہے۔ لیکن مصر اور بابل کی طرح خود یونانی عہد میں ترکیب و تیاری ادویہ کے طریقوں پر کوئی تحریر نہیں ملتی ہے۔ عرب اطباء نے دوسرے موضوعات کو منضبط اور باقاعدہ علمی مرتبہ دینے کے ساتھ ہی کیمیاوی اعمال مثلاً تصعید، تقطیر، تعریق، تشمیع، تکلیس و تحریق پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور دواسازی کو کناش، قرابادین یا مرکبات کی کتابوں کے علاوہ اپنے قلم کا مستقل موضوع بنایا ہے۔ عربی عہد کی طبی ترقیات کا یہ لازمی تقاضہ بھی تھا جسے ماہرین ادویہ نے پوری طرح محسوس کیا۔ پوری اسلامی دنیا میں شفاخانوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر بڑے شفاخانے میں دواسازی کیلئے دارالصیدلہ (فارمیسی) کے ساتھ ہی ایک مخزن الادویہ (میڈیکل اسٹور) ہوتا تھا۔ جہاں شفاخانہ میں روزانہ استعمال کے لئے ہر قسم کی دواؤں کی ایک بڑی مقدار جمع رہتی تھی۔ فراہمی ادویہ کے بڑے پیمانے پر نظم کے ساتھ ہی ادویہ کے معائنہ کا بھی انتظام تھا۔ ادارہ احتساب کی ذمہ داری کے علاوہ ادویہ کے معائنہ کے لئے علاحدہ افراد کا تقرر کیا گیا تھا۔ سرکاری شفاخانوں میں جہاں روزانہ ہزاروں مریضوں کا مرجوعہ ہوتا تھا۔ بہت بڑی مقدار میں مفرد اور مرکب دواؤں کی ضرورت رہتی تھی۔ مثال کے طور پر ملک منصور قلاؤن کے دمشق کے شفاخانہ کے متعلق ملتا ہے کہ

دوسری دواؤں کے علاوہ روزانہ صرف شربت انار ۵۰۰ رطل (ایک رطل یعنی ۵۰۰ ملی لیٹر) خرچ ہوتا تھا۔ شفاخانہ رشیدی تبریز کے لئے مختلف علاقوں سے ایک ہی موقع پر جو روغن دستیاب کئے گئے تھے ان کی تعداد ایک من سے تین سو من تک تھی۔ اسی طرح صرف ایک شفاخانہ کے لئے جو مفرد ادویہ ہر سال فراہم کی جاتی تھیں ان کی مقدار پچاس سے سو من تک ہوتی تھی۔

تعلیم ادویہ میں بھی جہاں طلبہ کو نباتات کی روئیدگی کے مقامات پر لے جاکر ان کا نظری مشاہدہ اور معائنہ کرایا جاتا تھا، وہاں شفاخانوں میں مفرد ادویہ کی شناخت اور مرکبات کی تیاری اور دواسازی پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا۔ فاضل زمانہ ابن بیطار کے علم الادویہ کے حلقہ درس کے شریک اور مشہور مورخ ابن ابی اصیبعہ کی کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء سے علم الادویہ کے اس طریقہ تعلیم پر واضح روشنی ملتی ہے۔

علم الادویہ کی اس شاخ کو صیدلہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ ایک عملی فن ہے لیکن اس کے سلسلے میں ادویہ کی شناخت کے ساتھ ہی اصولی ہدایات، تیاری کے طریقوں، اجزاء موثرہ حاصل کرنے کی تراکیب، دواؤں کو مختلف طریقوں پر استعمال کرنے کے اثرات، ان کو ترکیب دینے کی شکلوں، حفاظتی تدابیر اور دوسری متعلقہ باتوں کا بیان ضروری سمجھا گیا ہے۔ اصول تراکیب ادویہ اور علم الصیدلہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابوالعباس ابن رومیہ کا رسالہ مقالہ فی ترکیب الادویہ، محمد بن خجندی کی کتاب اصول التراکیب فی الطب، نجیب الدین سمرقندی کی کتاب اصول التراکیب، داؤد بن ابوالبیان کی دستور الادویۃ المرکبۃ، ابن الجزار کی البغیۃ فی الادویۃ المرکبۃ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ نجیب الدین سمرقندی کی کتاب کا ایک نسخہ اصول ترکیب الادویہ کے نام سے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے جو ۱۲۳۵ھ ۱۷۱۹ء کا مکتوبہ ہے۔ محمد بن زکریا رازی کی کتاب الصیدلہ کے علاوہ کتاب الجامع کی پانچویں قسم علم الصیدلہ سے متعلق ہے۔ حنین بن اسحاق کی کتاب اسرار الادویۃ المرکبۃ اس سلسلہ کی ایک زیادہ قدیم یادگار ہے۔

عربی کی کتابوں میں منہاج الدکان و دستور الاعیان فی اعمال وترکیب الادویہ کا نام لیناضروری ہے۔ ابونصر عطار اسرائیلی کی یہ کتاب اعمال دواسازی کا بہترین مجموعہ ہے۔

فارسی میں بھی اس روایت کو آگے بڑھایا گیااور متعدد اہم کتابیں لکھی گئیں۔ اس سلسلہ کی ایک ترکیب الادویہ ہے جو سالار جنگ میوزیم حید آباد میں محفوظ ہے۔ مہدی حسن بن مولوی محمود عالم اس کے مؤلف ہیں۔ تراکیب ادویہ کے نام سے مہدی حسن بن محمد حسن بشارت خاں کی بھی ایک کتاب اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد کے ذخیرہ طب کی زینت ہے۔ بعض قرابادینوں میں مرکبات کے نسخوں کے علاوہ ادویہ کی تیاری کے طریقوں پر بھی لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر احمد شاہ کے عہد کی ۱۱۶۲ھ ۱۷۴۸ء کی تصنیف قرابادین سکندر میں اس کے مصنف حکیم سکندر نے جسے انہوں نے ۲۵۰ کتابوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا ہے، تراکیب ادویہ کے طریقے بھی بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ اسی طرح مجربات اکبری میں حکیم اکبر ارزانی نے نسخوں کے ساتھ ان کی تیاری کے طریقے بیان کئے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں سے دواسازی سے متعلق کافی مواد فراہم ہوتا ہے۔

طب یونانی کے ہندی دور میں کشتوں کے علاوہ آیورویدک کے بعض مرکبات بھی استعمال کئے گئے ہیں، جن کے نام ان کی اصل کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً مالتی بسنت، معجون یوگراج گوگل، معجون سپاری پاک وغیرہ۔ لیکن اس قبولیت کے باوجود اصول دواسازی میں آیورویدک کے برخلاف بعض چیزوں میں ترمیم کی گئی اور دواسازی و فن تکلیس میں اس بات کالحاظ رکھا گیا کہ طب کی مزاجی خصوصیت اور انفرادیت قائم رہے۔ چنانچہ اعمال تکلیس میں یونانی اور آیورویدک کے فرق کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اطباء نے نہ صرف کشتہ کی تیاری میں مناسب ترمیم کی اور مزاج ادویہ کی رعایت سے آیورویدک سے مختلف بوٹیوں کا انتخاب کیا بلکہ ان کے مواقع استعمال، مقدار خوراک اور بدرقہ کے سلسلہ میں بھی اجتہادات کئے اور نئی راہیں وضع کیں اور

سمیات کی اصلاح و تدبیر پر خاص توجہ دی۔

علم الکیمیا اور علم التکلیس پر ابن سینا سے منسوب رسالۃ التکلیس کے علاوہ ہندوستان میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فارسی میں مخزن الاکسیر حکیم امام الدین پاک پٹنی اور اردو میں مفتاح الخزائن حکیم فیروز الدین، الاکسیر مع التکسیر حصین الدین احمد، جامع الاکاسیر نذیر احمد گنگوہی، جواہر کشتہ حکیم عبدالستار، صناعۃ التکلیس حکیم عبدالحفیظ اہم کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔

اس سلسلہ کی ایک بہترین کڑی منہاج الصیدلہ والکیمیا ہے جسے اس کے مولف حکیم محمد رفیق الدین نے نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ حکیم صاحب موصوف شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے وابستہ ہیں ان کے وسیع تدریسی تجربہ کی جھلکیاں اس کتاب میں نمایاں ہیں۔ دواسازی پر ایک جامع درسی کتاب کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ اس کتاب سے نہ صرف یہ کمی پوری ہوگی بلکہ طلبہ کے علاوہ اطباء اور دواسازی سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے حضرات کو بھی اس سے استفادہ کا موقع ملے گا۔ اس کامیاب کوشش پر حکیم محمد رفیق الدین تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ ان کی یہ کتاب طبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

۸ر مئی ۱۹۷۹ء

منہاج الصیدلہ اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا پہلا ایڈیشن اشاعت کے چند برس بعد ہی ختم ہوگیا۔ ایک عرصہ سے اشاعت ثانی کی کوشش کی جارہی تھی۔ طلبہ کا اس کے لئے خاص طور پر تقاضا تھا۔ لیکن چند در چند وجوہ سے اس کی طباعت مؤخر ہوتی رہی۔ اس درمیان اس کے مؤلف حکیم محمد رفیق الدین نے اپنے تدریسی تجربات کی روشنی میں مزید ترمیم و اضافہ کی ضرورت محسوس کی۔ اب یہ اضافہ شدہ کتاب اعجاز پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام رفیق دواسازی و کیمیاء قدیم کے نام سے شائع کی جارہی

ہے۔

اس میں حکیم صاحب نے جدید تکنیک کے ذریعہ دواؤں کی تیاری کے اور زیادہ مؤثر طریقے تحریر کئے ہیں۔ مثلاً تیزاب کشید کرنے کا جو قدیم طریقہ تھا اس کی جدید آلات کی مدد سے نئے انداز سے کشید کی گئی ہے۔ روغنیات کے حصول کے لئے بھی جدید طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ فارمیسی ایکٹ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختلف پانیوں کی خصوصیت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کو تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ میں دواسازی اور تیاری ادویہ کے طریقوں پر نظری بحث کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ قدیم علم الکیمیاء کے بیان پر مشتمل ہے اور تیسرے حصہ میں اعمال دواسازی کا ذکر ہے۔ پہلی اشاعت کے مقابلہ میں ضخامت کافی بڑھ گئی ہے۔

حکیم محمد رفیق الدین کو اس مضمون کی تعلیم و تعلم سے شروع سے تعلق رہا۔ منصبی ذمہ داری کے علاوہ اپنے ذوق اور شغف کی وجہ سے انہوں نے دواسازی کی عملی مشق بہم پہنچائی۔ عملیات کے دوران کتابوں میں درج ادویہ کی تیاری کے طریقوں میں جو نقصانات اور کمیاں انہوں نے محسوس کیں، ان کے ازالہ کے لئے جن نکات تک وہ پہنچے اور اس سلسلہ میں جو تجربات انہیں حاصل ہوئے، پھر جدید آلات سے آراستہ شعبہ علم الادویہ کی معیاری لیبارٹری میں انہیں مسلسل اور لگاتار ہر قسم کی دوائیں تیار کرنے کا جو موقع ملا، اس سب سے انہوں نے ایک اچھے معلم اور ایک اچھے محقق کے طور پر فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے نتائج کو منضبط کر کے کتابی شکل میں پیش کیا۔

طبیبوں کی موجودہ نسل کی دواسازی اور ترکیب ادویہ کی طرف بہت کم توجہ ہے۔ طبی کالجوں میں بھی اس کا بہت اہتمام نہیں ہے۔ یہ خالص عملی فن ہے، اس میں نظریات اور کتابی علم سے زیادہ مشق و مزاولت درکار ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی یہ کتاب اعمال صیدلہ و تکلیس کے نہ صرف نو آموز طلبہ بلکہ عام معالجین اور ترکیب ادویہ سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے تمام لوگوں کے واسطے بھی مفید اور معاون ثابت ہوگی۔ پہلی اشاعت پر نظر ثانی اور اضافہ کے لئے حکیم محمد رفیق الدین طالبان

علم طب کے شکریہ کے حقدار ہیں۔ انہوں نے جس احساس ذمہ داری اور مہارت فن کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس سے صیدلہ و تکلیس پر کام کرنے والوں کو تحریص و ترغیب کے لئے نت نئے تجربات کی راہیں ہموار اور منور محسوس ہوگی۔

۲۵/اپریل ۱۹۹۹ء

OO

تقدمہ کتاب الصیدلہ والمرکبات

آئین و قواعد صیدلہ اور فن تکلیس ودواسازی پر اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بعض نصابی ضرورتوں کے مطابق ہیں اور بعض میں نصاب سے قطع نظر تفصیل کے ساتھ متعلقہ فنی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ بعض طبی مضامین کے نصابی موضوعات اور ان کی ذیلی تفصیلات پیش کرنے میں مؤلف کے اسلوب اور طرز نگارش کے علاوہ نئی معلومات واطلاعات کا اظہار کم ہوتا ہے۔ جن موضوعات میں معلومات کا ایک وسیع خزانہ موجود ہے اور جن میں آئے دن عملی مشق اور نت نئے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے ان میں ایک صیدلہ اور دواسازی کا فن بھی ہے۔

علم الصیدلہ کے مطالعہ میں اس اہم نکتہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا کہ دواسازی کے اعمال اور طریقوں میں قطعی یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔ تیاری اور ترکیب کی اتنی بہت سی صورتیں ہیں جو سب کی سب کتابوں میں درج نہیں ہیں، لیکن وہ اطباء کے درمیان مروج ہیں اور یکے بعد دیگرے نقل کی صورت میں شاگردی نظام کے ذریعہ منتقل ہوئی ہیں۔ امرا اور اہل دول کو پیش کرنے کے لئے جو نسخے تیار کئے جاتے تھے ان میں خاص اہتمام کو دخل ہوتا تھا۔ اس لئے دواسازی کی ہر کتاب میں کچھ نئی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں جو مؤلفین کے ذاتی تجربات یا دوسروں کی فراہم کردہ غیر کتابی اطلاعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس سے فن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور بہت سی غیر منضبط تراکیب ضبط تحریر میں آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دو نفیس تراکیب کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جد محترم حکیم سید کرم حسین (تجارہ) تقویت باہ کے لئے سنکھیا کا جو مرکب تیار کراتے تھے اس کی ترکیب یہ تھی کہ پہلے سنکھیا کے ساتھ انڈوں کو چھلکے سمیت پانی میں ابلواتے تھے۔ اس کے بعد چھلکے دور کرکے انڈوں کی صرف زردی

حاصل کی جاتی تھی۔ پھر اس زردی میں چند اور مقوی دوائیں ملا کر اس کا حلوہ بنایا جاتا تھا۔ یہ بالواسطہ طور پر سنکھیا کا اثر حاصل کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ حکیم ابراہیم لکھنوی نے سل اور کھانسی کے مریض کیلئے دہی بڑوں کی نئی ترکیب وضع کی تھی۔ دال ماش کے بجائے تخم باقلا مقشر (جو کھانسی کے لئے مفید ہے) کی دال پیسی جائے اور اسکے بڑے بنا کر روغن مغز بادام شیریں میں بریاں کئے جائیں۔ پھر گدھی کے دودھ کا ضامن دے کر دہی جمایا جائے اور اس دہی میں بڑے بھگوئے جائیں۔ اسی طرح غذا میں بعض دیگر تراکیب مثلاً انڈے کی کڑھی، کچنال کے شامی کباب وغیرہ ان سے منسوب ہیں۔

زیر نظر کتاب الصیدلہ والمرکبات حکیم محمد حامد صفوی ریڈر شعبہ علم الصیدلہ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد کی طویل تدریسی معلومات کا نچوڑ ہے۔ مؤلف نے درس و تدریس کے علاوہ معالجانہ اور متصوفانہ مصروفیتوں کے باوجود اس کے لئے وقت نکالا اور طلبہ کی افادیت کے لئے سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے نصاب کے مطابق یہ کتاب تیار کی۔ حکیم صاحب کے ہاں طب کا سلسلہ اوپر سے قائم ہے۔ ان کے عم محترم حکیم شاہ عبدالرحمٰن کامیاب معالج تھے۔ عام لوگوں کے علاوہ رؤسا اور متعدد ریاستوں کے فرمانروا ان کے زیر علاج رہتے تھے۔ فن کیمیا میں انہیں خصوصی عملی مہارت تھی۔ حکیم حامد صفوی کو شروع سے ان کی سرپرستی حاصل رہی۔ انہوں نے جہاں ان سے طب اور تصوف کے رموز سیکھے وہاں کیمیا اور دواسازی کی عملی مشق بھی بہم پہنچائی۔

کسی بھی موضوع پر متعدد کتابوں کے سامنے آنے کے بعد ہی ان مختلف کتابوں کی قدر و منزلت اور مؤلف کی کاوشوں پر قرار واقعی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے بعض اہم عنوانات قائم کر کے اس کتاب کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ دواؤں کے "معیاری بنانے کے اصول و قواعد" اور ان کی معیار بندی اور جدید تحقیق کے اعتبار سے نہایت ضروری عنوان ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں دوسری مفید معلومات

اس طرح یکجا کی گئی ہیں کہ طالب علموں کو عام درسی انداز اور روایتی طریقہ سے ہٹ کر کچھ نئی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بیشتر کتابوں میں بعض عنوانات کے بارے میں ایک عام قاری کو تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ طالب علم کے سامنے اس کا پورا مفہوم واضح نہیں ہوتا اور وہ بہت محدود اور "نوٹس" کے طرز کی ایک چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اپنے موضوع کے مختلف عنوانات کی تشریح جس جامع اور سلیس انداز میں کی گئی ہے، اس سے طالب علم ضروری تفصیلات سے بے خبر نہیں رہتا۔ دوران تالیف جدید مصنفین کی کتابیں بھی حکیم صاحب کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ ان کا عکس کتاب کے صفحات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ صیدلہ و تکلیس کے علاوہ اس میں نصاب میں شامل ادویہ مرکبہ کو بھی درج کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ حکیم صاحب کی یہ کوشش طلبہ اور شائقین فن کے لئے مفید ثابت ہوگی اور علم الادویہ کے ذخیرہ میں اسے ایک اچھا اضافہ سمجھا جائے گا۔

یہ کتاب طباعت کی منزلوں سے نہیں گزری تھی کہ ۳۱ر جولائی ۱۹۸۸ کو حکیم صاحب کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔ ان کے پانچ صاحبزادوں میں حکیم محمد سرکار صفوی اور شاہ رضوان حامد صفوی کا تعلق طب سے ہے۔ رضوان حامد صفوی سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں ان کی جانشینی کے ساتھ فرائض مطب بھی انجام دے رہے ہیں۔ کتاب الصیدلہ والمرکبات حکیم صاحب مرحوم کی ایک مفید فنی یادگار ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ صاحبزادہ موصوف کے زیر اہتمام اس کی طباعت عمل میں آرہی ہے۔

۲۲ر فروری ۱۹۹۴ء

OO

تقدمہ یونانی فارماکوپیا

(رفیق مطب)

یونانی نسخوں اور اطباء کے معمولات پر ہمارے ذخیرہ میں کافی کتابیں موجود ہیں۔ ان کی افادیت اور مطب اور معالجہ میں ان کی پوری اہمیت کے باوجود اس موضوع پر حاذق معالجین کی کتابوں کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی جائے گی۔

دوران علاج ہر طبیب کے تجربہ میں ایسی دوائیں آتی رہتی ہیں جو مختلف امراض میں نہایت مفید اور کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔ وہ کتابی نسخوں پر بھی مشتمل ہوتی ہیں اور خود ان کی وضع کردہ بھی۔ سمجھدار معالج کثرت تجربہ اور علم و مطالعہ کے ذریعہ بعض ایسی مفرد ادویہ کے انتخاب اور ترتیب نسخہ میں کامیابی حاصل کرتا ہے، جن پر ضروری نہیں کہ دوسرے طبیبوں کو بھی تجربہ کا موقع ملا ہو۔ بعض اطباء کے بارے میں تو یہاں تک ہے کہ ان کا پورا علاج چند مفرد اور اسی طرح چند مخصوص مرکبات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور ان چند دواؤں کی الٹ پھیر سے وہ مختلف امراض میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس قسم کے نسخوں کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا اہتمام کیا ہے جب کہ بہت سے لوگوں کے تجربے میں واقع اس طرح کے بکثرت موثر نسخے سینوں میں دب کر رہ گئے اور ان کے بعد ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکا۔

یونانی فارماکوپیا (رفیق مطب) کے عنوان سے حکیم محمد رفیق الدین ریڈر شعبہ علم الادویہ نے چند ایسے ہی مرکبات کا مجموعہ تیار کیا ہے اس میں نہ صرف ان کے ذاتی

تھری وے پرنٹرس علی گڑھ۔ ۱۹۹۰ء

معمولات بلکہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دیگر اساتذہ کے معمول بہا نسخے شامل ہیں۔ ان مرکبات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کے تحت صرف قرص، حب یا شربت کی شکل میں ہیں۔ لعوق اور خمیروں کو ثانی کی صورت میں پیش کیا ہے اور ان کی تیاری کا طریقہ بھی لکھا ہے۔

حکیم محمد رفیق الدین طبیہ کالج علی گڑھ سے ۳۳ سال مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔ اب ایک ہفتہ بعد وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو رہے ہیں۔ ابتداء میں دس برس انہیں شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی مرحوم کے مطب میں بیٹھنے اور ان کے کامیاب معالجہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اس سے مقدور بھر استفادہ کیا۔ شفاء الملک مرحوم کے مطب کا رنگ علی گڑھ کے بعض دیگر اساتذہ کی طرح ان کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ مجھے امید ہے کہ حکیم محمد رفیق الدین کی دوسری کتابوں رفیق التشخیص، رہنمائے بخار، منہاج الصیدلہ والکیمیا اور کنز المفردات الادویہ کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہوگی۔

۱۰ر مئی ۱۹۹۰ء

تقدمہ بیاض خاص

یونانی طب کے ذخیرہ میں طبی نسخوں کے مجموعے دوہری اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ علم العلاج اور علم الادویہ کے گہرے قریبی رشتہ کی علامت اور اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ علاج امراض میں جہاں یہ نہایت مفید اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں وہاں نظام وار کیا بلحاظ امراض اور کیا بلحاظ اعضاء مفردات کے مطالعہ میں ان سے مدد ملتی ہے۔ معالجات کی طرح علم الادویہ کی معلومات کا انہیں نہ صرف خاص ماخذ سمجھنا چاہئے بلکہ مختلف حیثیتوں سے خواص وافعال ادویہ پر انجام دیئے گئے کاموں میں اطلاقی شکل کی بنا پر ان میں افادیت کے جو پہلو ہیں انہیں بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

طب کے کسی بھی موضوع کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تنوع نسخوں کے مجموعوں میں ملتا ہے۔ معالجہ کے دوران طبیب کو تشخیصی نکتوں کی طرح تجویز دوا کے سلسلے میں جو تجربات حاصل ہوتے ہیں، وہ کتابوں اور اساتذہ کے افادات نیز دوسرے اہل فن کے تجارب سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر معالج کے تجربے میں بعض ایسی دوائیں اور اسی طرح ان کی مرکب شکلیں آتی ہیں جو نہ صرف اس کی معالجانہ زندگی کا حاصل ہوتی ہیں بلکہ فن علاج کے سلسلہ میں ایک طرح کے اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان چیزوں کو ضبط تحریر میں لانے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے صاحب نظر معالجین کو تجربے کی نئی راہ ملتی ہے اور اپنے زیر علاج مریضوں کے احوال و کوائف کی روشنی میں اختراعات کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ ان اختراعات کی بدولت جہاں معالجہ میں نت نئی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور معالج کی حذاقت اور ماہرانہ دسترس کا اظہار ہوتا ہے وہاں ان کی ترتیب و تہذیب فنی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کا باعث بنتی ہے۔

مطبوعہ نیو پبلک پریس، دہلی، ۱۹۸۷ء

ان طبوں میں جن میں علاج کا سارا انحصار پیٹنٹ دواؤں پر ہے اور جہاں ادویہ کی ترکیب و تیاری دوا ساز اداروں کی رہین منت ہے مثلاً ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، ان کے عاملین کا معاملہ مختلف ہے۔ انہیں مفرد دوا کے انتخاب واثر کے مطالعہ یا ان کے آمیزہ اور ترکیب دہی کا ذاتی طور پر موقع نہیں ملتا۔ ان کے مخصوص علاجی طریقہ کی وجہ سے وہاں ان تجربات کی گنجائش نہیں ہے جو آئے دن دیسی معالجین کی زندگی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ نسخوں کے متقرر اور متعین نہ ہونے کی بنا پر یونانی اطباء مفرد دواؤں کے ساتھ ان کی ترکیب کے جو تجربے کرتے رہتے ہیں، کبھی ان کی زود اثری اور قوت نفوذ کو بڑھانے، کبھی ان کی قوت کو ضعیف اور بطی کرنے، سمی اثرات کی اصلاح، بعض قیمتی اور غیر دستیاب شدہ دواؤں کے بدل، مرکب کی شکل کے لحاظ سے مفردات کے انتخاب، رنگ بو ذائقہ اور شکل کی اصلاح، اسی طرح مختلف حالات و کیفیات کی مناسبت اور دوسری رعایتوں کے مطابق اجزاء میں تغیر و تبدل، نسخوں کے یہ بکثرت مجموعے انہی تجربات کا مظہر ہیں۔

اسے طب یونانی کے مفاخر میں سمجھنا چاہئے کہ ہر دور میں حاذق معالجین نے اس قسم کے مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ بعض نے محض ذاتی نسخوں پر اکتفا کیا ہے اور بعض نے اپنے معمولات کے ساتھ دوسرے معالجین کی مجرب و منتخب دوائیں بھی شامل کی ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کے بعض مجموعے ان کے شاگردوں کے ذریعہ مرتب ہوئے ہیں۔ طب یونانی کے عربی و ایرانی عہد میں کافی تعداد میں اس طرز کی کتابیں لکھی گئیں لیکن ہندوستان میں اس کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا۔ نسخہ نویسی نے یہاں ایک مہذب و مرتب فن کی شکل اختیار کی۔ اور یہاں کے حاذق معالجین نے اس میں خوب خوب جدتیں اور ندرتیں پیدا کیں۔ علم العلاج کے اس شعبہ کو وقیع بنانے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ صاحب فن طبیبوں کے مجموعوں میں نہ صرف نسخہ نویسی کی شان بلکہ طلبہ اور مبتدیوں کی فنی تربیت کا اہتمام بھی ملتا ہے۔ اس طرح متعلقہ نظام کی ادویہ پر ان کی گرفت، استعمال کے سلیقہ، ترکیب

نسخہ کے حسن و یکساں خواص کی حامل دوا کے انتخاب کی کامیاب کوشش دیکھی جا سکتی ہے۔ مطب عملی کی اہمیت کا یہی راز ہے۔ اساتذہ کے مطب میں حاضری اور ان کی تشخیص و تجویز دیکھنے کے بعد نسخہ نویسی کا شعور اور اس کا مذاق پیدا ہوتا ہے۔ پھر مشق و مزاولت اور بکثرت مریضوں کے ملاحظہ کی روشنی میں خود بخود نسخہ کی شان میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ یہ مختلف روش اور اچھوتا انداز جو معالجاتی زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے، کتابی شکل میں ڈھلنے کے بعد اس کی آب و تاب دوسرے مجموعوں سے اسی لیے مختلف ہوتی ہے کہ اس میں مصنف کی اپنی شخصیت کی تابناکی اور ذاتی تجربات کی جھلکیاں شامل ہوتی ہیں۔ ماہرین فن کے نسخوں میں اس کا اظہار اگرچہ زیادہ نمایاں شکل میں ہوتا ہے لیکن کم و بیش ہر مجموعے میں بعض ایسے نسخے ملتے ہیں جو واقعی نہایت مفید اور کار آمد ہوتے ہیں۔

نسخوں کی ترتیب اطباء ہند کے پسندیدہ موضوعات میں ہے۔ یہاں اس قسم کی کتابوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اور دستورات، معمولات، مجربات، بیاض اور مطب کے عنوان سے کافی کام کیا گیا ہے۔ ان میں بیشتر کتابیں اگرچہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں اور مخطوطات کی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ اس کے باوجود جو کتابیں طبع ہوئی ہیں، ان کا شمار بھی کم نہیں ہے۔ ان کے تمام تر نسخے ہندوستانی طبیبوں کے معمولات اور ان کی آزمودہ دواؤں پر مشتمل ہیں۔ اور ان کے ذریعہ علم العلاج اور علم الادویہ کی قیمتی معلومات اور انتخاب دوا اور تجویز نسخہ کے سلسلہ میں ان کی ندرت فکر و فن کا اظہار ہوتا ہے۔

عزیزی حکیم افتخار احمد نقوی نے بیاض خاص کے نام سے اس سلسلہ کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اساتذہ اور ماہرین فن کے کار آمد اور زود اثر نسخے کافی تعداد میں جمع کئے ہیں۔ مختلف امراض کے یہ نسخے ایک کامیاب مطب کے ضامن ہیں اور ان کے ذریعہ مطب کی ذمہ داریوں سے بڑی حد تک عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ نسخوں کی آبرو مجروح ہونے کے خیال سے انہوں نے روایتی زبان فارسی کو قائم رکھا ہے۔ فارسی داں طبیبوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ استفادہ عام کے لیے

اس کا اردو میں ہونا ضروری تھا۔ طب کے ہر موضوع کی کتابیں اردو میں آچکی ہیں اور بیسویں صدی کے ربع اول سے اسے طب کی تعلیمی زبان کا مرتبہ حاصل ہے۔

حکیم افتخار احمد نقوی سہسوان کے ایک ذی علم گھرانہ کے فرد ہیں۔ تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے فراغت کے بعد اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے علم الادویہ میں انہوں نے ایم ڈی کیا ہے۔ ان کا پہلا علمی کام آفتاب ہال کا میگزین ہے، جو ان کی ادارت میں ۱۹۸۴ء میں شائع ہو کر یونیورسٹی میں مقبول ہوا۔ طب یونانی سے انہیں طبعی مناسبت ہے اور یہ کتاب ان کے فنی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ نسخوں کے اختصار اور افادیت کی وجہ سے ان کی یہ کاوش طلبہ اور طبی معالجین کے لیے یقینی طور پر مفید ثابت ہو گی۔

۶/ اکتوبر ۱۹۸۶ء

OO

تقدمہ اصول نسخہ نویسی

طب یونانی کے امتیازات میں جن چیزوں کا شمار کیا جاسکتا ہے، ان میں اس کے اصول علاج کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ یونانی نظام طب میں علامت مرض کا دوسرا نام عرض قرار دیا گیا ہے، جو سبب کے تابع ہوتا ہے۔ اسباب کی تبدیلی سے علامت اور نوعیت مرض میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ایک مرض متعدد اسباب کے نتیجہ میں اسی مرض کے دوسرے مریض سے مختلف علامات صادر کرتا ہے۔ مرض کی علامت کے بغور مطالعہ، ان کے اسباب کی تلاش و تحقیق اور اسباب کی جداگانہ نوعیتوں کے لحاظ سے علاج کی ترتیب و تدوین پر ماہرین علم العلاج نے جو کوششیں صرف کی ہیں، اس نے یونانی نظام کو بہت باقاعدہ مرتب اصول علاج عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی میں سبب کی تبدیلی کی بنا پر ایک ہی مرض کے اس کثرت سے نسخے ملتے ہیں کہ دوسری کوئی طب اس کی مثال نہیں پیش کرتی ہے۔ یہ بڑے فنی کمال کی بات ہے۔ اطباء نے اس میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

علاماتی علاج جو ہومیوپیتھی سے زیادہ ایلوپیتھی طریقہ علاج کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے اور جس پر عمومیت کے ساتھ موجودہ دور کے عاملین عمل پیرا ہیں، صحتی مسئلہ کے حل میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ صحت کے محاذ پر اسی وقت کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوا جاسکتا ہے، جب اسباب مرض کو پوری اہمیت دے کر ایسی ادویہ سے علاج کی کوشش کی جائے جو ضمنی مضر اثرات سے خالی ہوں۔ اسی طرح یہ کہ محض ایک دوا ایک مرض کے سارے مریضوں کے لیے کافی نہ سمجھی جائے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یونانی طریقہ تعلیم میں تجویز اور ترکیب نسخہ کے اصولوں پر بہت توجہ دی جاتی

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۹۲ء

تھی۔ مختلف عوارضات، کیفیات، درجات، عمر، جنس، موسم وغیرہ کے لحاظ سے ایک ہی مرض کے مختلف مریضوں کے نسخوں اور ان میں ترمیم واضافہ کی طرف طلبہ کی توجہ مبذول کی جاتی تھی اور ان کی فنی تربیت میں علاماتی علاج کے مقابلہ میں اصول علاج کو واضح کیا جاتا تھا۔

لکھنؤ جس نے ہندوستان میں یونانی علاج کے اصول و ضوابط کو نہ صرف کامیابی سے برتا بلکہ حذاقت اور اجتہادی قابلیت کے ذریعہ ان فنی اقدار کو مزید ترقی دی۔ لکھنوی اطبا کے مطب علاج کے ان اصولی طریقوں کے بہترین نمونے تھے، جنہیں طب یونانی میں بڑے اہتمام کے ساتھ وضع کیا گیا ہے۔ ان کی اور دیگر مشاہیر طب کی کوششوں سے ہندوستان میں فن نسخہ نویسی کو بڑی ترقی حاصل ہوئی ہے۔

یونانی دواساز اداروں کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ محسوس کئے جانے کے لائق ہے کہ صیدلہ اور دواسازی کے میدان میں نمایاں پیش رفت اور مرکبات کے بکثرت رواج نے اصول مطب اور فن نسخہ نویسی کو متاثر کیا ہے۔ مرکبات کی تیاری اور استعمال موجودہ ہنگامی زندگی کے مطالبات اور وقت کے واقعی تقاضوں کے عین مطابق ضرور ہے، اور اس سے اعراض اس سہولت پسند اور مشینی دور میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن اصول علاج اور فن نسخہ نویسی پر دواسازی کی اثر اندازی علماء طب سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہئے۔ نصاب اور طلبہ کی فنی تربیت کے دوران اس پر خصوصی توجہ درکار ہے۔

معالجات کی کتابوں میں اصول مطب سے متعلق رموز و نکات کا قیمتی مواد پیش کیا گیا ہے۔ مستقل حیثیت سے اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حکیم حافظ جلیل احمد (تکمیلی) مرحوم کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ افادات مسیح الملک اور مطب عملی وغیرہ کے علاوہ ان کی تالیفات تذکرہ جلیل، تجویز جلیل اور افادہ جلیل اردو میں اس موضوع کی بہترین کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تکمیل الطب کالج

لکھنو کے فارغ شدہ جواں سال وذی استعداد طبیب آفتاب احمد نے اس کو موضوع قلم بنایا اور محنت و مطالعہ سے ایک اچھی کتاب "اصول نسخہ نویسی و مطب" کے نام سے مرتب کی۔ اس میں انتخاب دوا، ترکیب نسخہ اور قانون علاج پر لکھنے کے علاوہ ادویہ مفروہ کے بدل، مرکبات کی مقدار، مزاج اور غذا و پرہیز کے تعلق سے تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں جدید معلومات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور انہیں سلیقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے اس کام کے لیے عزیزی آفتاب احمد قدر کے مستحق ہیں۔ ان کا یہ پہلا تالیفی نقش ہے۔ امید ہے وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے اور یک سوئی و دلجمعی کے ساتھ مطالعہ و تفحص سے ان کی فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوگی۔ ان کے علمی مستقبل کی جو پرچھائیاں اس کتاب میں نظر آتی ہیں، میری دعا ہے کہ نقش ثانی میں وہ اس سے زیادہ روشن اور تابناک شکل میں نمایاں ہوں۔

۲۳ر مئی ۱۹۸۸ء

OO

تقدمہ رہنمائے تشخیص

انسانی نفس کی طرح انسانی جسم بھی نہایت پیچیدہ نظام کا حامل ہے۔ یہ پیچیدگی ماہرین طب کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ اور ہر زمانہ میں مختلف دوسرے علوم کی مدد سے بدن انسان کا طبعی و غیر طبعی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔ منافع الاعضاء اور ماہیت الامراض کی وسیع معلومات نے طب کی ترقی میں جو حصہ ادا کیا ہے۔ اور معالجات میں ان منافعائی اور مرضیاتی تحقیقات سے جو فائدے حاصل ہوئے ہیں، ان کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

طب یونانی میں صحت و مرض اور طبعی و غیر طبعی تغیرات کے مطالعہ میں بدن انسانی کو موضوع بنا کر جسم اور روح کے درمیانی رشتہ کو اہمیت دی گئی ہے۔ اور انسان کو ایک کیمیاوی مرکب کی حیثیت سے نہیں ایک ذی روح مخلوق کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ اس نے انسان کو ایک مشین سمجھ کر طبعیاتی و کیمیاوی معملوں کے حوالے کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ محسوسات کے ذریعہ اس کی داخلی و خارجی کیفیتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح انسان کے ذریعہ انسان کے مطالعہ نے حواس سے کام لینے کی صفت کو ابھارا اور فکری قوت اور تیز مشاہدہ کے ذریعہ چھپی ہوئی اندرونی تبدیلیوں کا پتہ لگانے کی سعی کی۔ مطالعہ مرض اور تحلیل نفسی میں اس سے نہایت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ لیکن تصور میکانیت سے یہ طریق کار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ قوت مشاہدہ، عمیق و دقیق فاضلانہ استدلال اور سریاتی تجربہ کے ساتھ نظری، لمسی، حسی اور سمعی معائنہ، اسی طرح نبض، بول اور براز اور دوسرے افرازات کے واسطے سے مرض تک پہنچنے کی کوششوں کی وجہ سے مریض اور معالج کا جو گہرا قریبی

مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۴ء

رشتہ تھا وہ آج کافی مضمحل ہو چکا ہے۔

کیمیاوی معمولوں اور آلات کے استعمال کی کثرت نے معالج کو مریض سے دور کر دیا ہے۔ مرض کی تشخیص میں محض آلات پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ معالج کو آنکھ، ناک، کان، زبان، ہاتھ اور دوسری چیزیں بھی استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن معالج اب ان صلاحیتوں اور فکری قوتوں کا استعمال نہیں کرتا۔

موجودہ زمانہ میں ایک طبی طالب علم کو سریاتی اور کلینکی مشق کے مواقع بہم پہنچنے کے بجائے اس کا بیشر وقت لیبارٹریز میں صرف ہوتا ہے۔ نظام اوقات میں مریض کے بستر کے پاس زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہ ملنے کے باعث وہ براہ راست انسان کے مطالعہ سے محروم ہو کر لیبارٹریز کا محتاج ہو جاتا ہے جن کی مدد کے بغیر معمولی امراض کی تشخیص کی صلاحیت بھی نہیں رہ جاتی ہے۔ سادہ اور معمولی بیماریوں کی تشخیص میں وقت اور رقم دونوں کا جو ضیاع ہوتا ہے وہ نہ ایک عام آدمی کے بس کی بات ہوتی ہے اور نہ فنی طور پر اس کے زیادہ مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مغربی نظام طب کے ماہرین اب اس غیر ضروری اور ناواجب صورتحال کو محسوس کر رہے ہیں۔

یونانی طبیب کے ہاں ذات کی بصیرت کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ اطباء نے ہر طرح اسے جلا دینے کی کوشش کی ہے۔ طب یونانی میں تشخیص کا عمل صرف مرض کی حد تک نہیں ہے۔ اس کا دائرہ تشخیص مریض اور تشخیص دوا تک پھیلا ہوا ہے۔ تشخیص مریض میں بنیادی طور پر نظریہ مزاج کار فرما رہتا ہے۔ شخصی مزاج اور انفرادی طور پر ہر مرض کے عوامل اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تشخیص دوا یعنی دوا کا انتخاب بلحاظ مرض و مریض کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ایک مرض کے متعدد مریضوں کی دوائیں یکساں نہیں ہوتی ہیں۔ تشخیص دوا اور ترکیب نسخہ کو یونانی میں بطور فن برتا گیا ہے۔ یونانی نصاب میں مطب کی حاضری لازمی قرار دی گئی تھی۔ وہاں روزانہ بکثرت مریضوں کو دیکھنے اور تشخیص و تجویز کے جو مواقع میسر ہوتے تھے اور طالب علم کے اندر جو خصوصی ملکہ پیدا ہوتا تھا وہ دراصل مرض کو مریض ہی کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کا

نتیجہ تھا۔ محض کتاب اور کیمیاوی معمل سے تشخیص کی یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوتی۔

اطباء نے اندرونی بیماریوں کو خاص باریک بینی سے پہچانا تھا۔ اور ان کی ظاہر ہونے والی علامات کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ علامات، مرض کے مقابلے میں جسم کے رد عمل کا نام ہیں۔ اسی لیے امراض کے سلسلہ میں ان کی علامات پر انہوں نے خاص توجہ مرکوز کی۔ بعض امراض کے نام بھی ان کی غالب علامات کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔ امراض کے بیان میں علامات پر جس تفصیل سے یونانی طبیبوں نے لکھا ہے وہ ان کے امتیازات میں ہے۔ دوسری طبوں میں اس طرح کی تفصیلات نہیں پیش کی گئی ہیں۔ نہ صرف معالجات کی کتابوں میں تشخیصی نقطہ نظر سے علامات کو نمایاں کیا گیا ہے بلکہ تشخیص فارقہ پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔

اسحٰق بن حنین (وفات ۲۹۸ھ/۹۱۰ء) کا رسالہ فروق الامراض اس موضوع پر عربی عہد کی ابتدائی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نجیب الدین سمرقندی (وفات ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) نے بھی جو اپنی کتاب اسباب و علامات اور اپنی قرابادین کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہے، فروق الامراض کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "اسباب و دلائل کے اشتراک کی بنا پر امراض میں مشابہت پائی جاتی ہے اور ان کی تشخیص میں دشواری ہوتی ہے اس لیے فروق الامراض میں اشتراک و تشابہ اور ان کے درمیانی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔"

ہندوستانی مصنفین میں حکیم احمد سعید رضوی افسر الاطباء اول حیدر آباد کی تشخیص کامل اور حکیم نذیر الدین احمد کی فروق الامراض اس سلسلہ کی عمدہ کوششیں ہیں۔

حکیم احتشام الحق قریشی ایم ڈی یونانی لیکچرر تکمیل الطب کالج لکھنؤ نے محنت و سلیقہ سے اصول و کلیات تشخیص پر زیر نظر کتاب رہنمائے تشخیص لکھ کر اس سلسلہ کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ انہیں یہ ذوق اپنے والد گرامی حکیم افتخار الحق تکمیلی سے ورثہ میں ملا ہے، جو ایک صاحب نظر عالم طب ہیں۔

امراض متشابہ کی تشخیص کا مرحلہ خاص طور پر دشوار ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ان

ملتے جلتے امراض کی تفریق کے لیے کار آمد نکتے بیان کیے ہیں۔ مرض اصلی و مرض شرکی اور مادی و سازج علامات کا فرق نمایاں کیا ہے۔ ایجابی و سلبی علامات اسی طرح انتقال امراض پر روشنی ڈالی ہے۔ تشخیص کے بعض جزئیاتی مسائل بھی مرتب کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان کے اقسام اور ان کے باہمی امتیازات پر بھی انہوں نے لکھا ہے۔ تشخیصی علامات کے بیان سے قبل تشخیصی اشارات کے عنوان سے کام کی باتیں آگئی ہیں۔

چونکہ تشخیص امراض کا ان کی علامات غیر طبعیہ سے براہ راست رشتہ ہے۔ اس لیے اس کتاب میں علامات غیر طبعیہ کا شرح وبسط سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور یہی اس کتاب کا اصل حصہ ہے۔ علامات غیر طبعیہ کے ساتھ ہی طبعی علامات بھی تحریر کی گئی ہیں۔

رہنمائے تشخیص نظام امراض کے لحاظ سے مرتب ہے۔ امراض راس سے ابتدا کرتے ہوئے اسے امراض ظاہرہ بدن پر ختم کیا گیا ہے۔ بیشتر معروف امراض اس کے دائرہ میں آگئے ہیں۔ آخر میں زہر خوری کی عام مختصر علامات مذکور ہیں۔ اس مفید اور پراز معلومات کتاب کے لیے عزیزی حکیم احتشام الحق قریشی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے اس کے ذریعہ تشخیص کے سلسلے میں یونانی اطباء کی کاوشیں طالبان فن کے سامنے آئیں گی اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

۲۸/اپریل ۱۹۸۳ء

OO

تقدمہ تشخیص اسباب وعلامات

طب یونانی کا مخلوط نصاب جسے ۱۹۲۵ء میں طبی ماہرین تعلیم نے بڑی توقعات کے ساتھ مرتب کیا تھا اور جو یونانی کے ساتھ علیحدہ سے ایلوپیتھی مضامین پر مشتمل تھا۔ اس کی افادیت یا ضرر رسانی پر اگرچہ اس وقت بھی کافی بحثیں رہیں۔ اطباء کے ایک طبقہ نے اسے اندیشوں کی نگاہ سے دیکھا اور اس آمیزش کو یونانی کے حق میں خطرناک قرار دیا۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی تائید یا تردید اس وقت خواہ آسان نہ رہی ہو، اس لئے کہ دونوں مکتبوں کو طب کے بہی خواہ اور اس عہد کے گرامی منزلت اطباء کی حمایت و سرپرستی حاصل تھی۔ لیکن چالیس سال کے تجربہ کے بعد آج جو نتائج ہمارے سامنے ہیں، ان سے اس اندازہ میں دیر نہیں لگتی کہ موخر الذکر طبقہ کی رائے کتنی معقول اور کتنی دور اندیشی و فراست پر مبنی تھی۔

یونانی نظام فن اور اس کے مزاج و روح اور کلیات و مبادیات سے متصادم ہونے کی وجہ سے اس مخلوط نصاب کے لازمی اثرات یقینی طور پر محسوس کئے جانے کے لائق ہیں۔

کسی علم و فن کے مخصوص ڈھانچہ اور اصول و نظریات کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید علمی چیزوں سے استفادہ بلاشبہ ضروری ہے۔ لیکن جذب و قبول کے بجائے جدید و قدیم کی تفریق باقی رکھ کر بے جوڑ اور بے ربط طریقہ پر یونانی کے ساتھ علیحدہ سے مستقل حیثیت میں ایلوپیتھی مضامین کی شرکت نہ یونانی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے اور نہ اسے اس ذریعہ سے ترقی کا زینہ مل سکتا ہے۔

یونانی نقطہ نظر سے ایلوپیتھی کتابوں کے ترجمے خواہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھے جائیں لیکن نصاب میں ایلوپیتھی مضامین کی موجودگی میں طلبہ کے واسطے ایسی کتابوں

وصیۃ المعارف دیوبند ۱۹۷۲ء

کی تالیف یا ترجمہ ایک ضروری سی چیز ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر اردو میں تقریباً ہر طبی موضوع پر ایلوپیتھی کی انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ اور بعض موضوعات پر متعدد اہم کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو Yater اور oliver امریکی مصنفین کی کتاب Symptom Diagnosis کے صرف امراض صدر و ریہ و قلب کے اسباب و علامات کے حصہ کا خلاصہ ہے۔ اصل انگریزی کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب تقریباً ۸۰ امراض قلب کے اسباب و علامات پر مشتمل ہے اور اس میں ۶۰۰ سے زیادہ اسباب سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان امراض کے وہ اسباب جو نادر و کمیاب (یا قلیل الوقوع) ہیں وہ بھی تقریباً ۶۰۰ سے زیادہ ہیں۔ اس مضمون پر لکھی جانے والی کتابوں میں اپنی نوعیت کی یہ واحد کتاب ہے۔

اس کتاب کی تلخیص کے لیے اردو خواں طلبہ جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل استاذ مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

موصوف عربی کے ساتھ ہی انگریزی کی بھی اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ اور مخصوص علمی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ ان کا ذوق مطالعہ، علمی شغف و انہماک قابل قدر ہے۔ متعدد دوسری کتابیں ان کے زیر قلم ہیں جن میں ایک ٹیبر س میڈیکل ڈکشنری کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

ترجمہ میں بعض جگہ ناہموار عبارت اور ثقیل اصطلاحات کا استعمال ملتا ہے۔ لیکن اصطلاحی زبان کے ترجمہ سے جن لوگوں کا واسطہ رہا ہے وہ اس دشواری کا صحیح احساس کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود زبان کو سلیس اور آسان بنانے کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ امید ہے درسی اور غیر درسی دونوں لحاظ سے یہ کتاب مفید ثابت ہو گی اور اس موضوع کا مطالعہ کرنے والے حکیم صاحب موصوف کی اس مخلصانہ و کامیاب کوشش کو قدر و استحسان سے دیکھیں گے۔

۱۱ر مئی ۱۹۷۲ء ○○

تقدمہ جدید اسباب الامراض اور معالجات

یونانی نظام طب جن مستقل پائیدار علمی اصولوں پر قائم ہے ان میں سب سے شاندار اور پر کشش مزاج و اخلاط کا نظریہ ہے۔ طب کے بنیادی نظریات اور کلیاتی مسائل کی تعبیر و توجیہہ کی طرف ہمیشہ ماہرین فن کی توجہ مبذول رہی ہے۔ ان مباحث کو اہل علم نے جس شوق و دلچسپی کے ساتھ اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے، طبی ذخیرہ کی بے شمار کتابیں اس پر گواہ ہیں۔ کلیات قانون ابن سینا اور اس کی بکثرت شروح مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ماضی قریب میں حکیم اجمل خاں کی رہنمائی میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی طرف سے کی جانے والی مساعی اور قانون عصری (مرتبہ حکیم الیاس خاں دہلی) اور موجودہ عہد میں حکیم حاجی عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کے ذریعے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر یونانی نظریات کو سائنس کی روشنی میں حل کرنے کی جو منظم وارفع تحریک شروع کی گئی ہے، اس کے نتائج گو ابھی بر آمد نہیں ہوئے ہیں، لیکن ان کے ذریعہ تحقیق کے جو گوشے سامنے آئے ہیں، ان سے طب کے سائنسی مطالعہ میں نئی سمتوں کے تعین میں رہنمائی ملتی ہے۔ اس سلسلے کی قابل قدر مساعی میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے مضمون "عناصر" کا تذکرہ ضروری ہے جسے انہوں نے حکیم اجمل خاں کی زیر صدارت آل انڈیا طبی کانفرنس منعقدہ رامپور ۱۹۲۷ء میں پیش کیا تھا۔ ان کے دوسرے مضامین مزاج و اخلاط کے ساتھ تجدید طب کے نام سے ۱۹۷۲ء میں راقم الحروف نے اسے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔

اس سمت میں رامپور منہیاران کے ایک ذہین نوجوان طبیب حکیم جمیل احمد کی

مطبوعہ محبوب پریس، دیوبند، ۱۹۸۴ء

کتاب مزید پیش رفت کا باعث ہے۔ انہوں نے جدید منافعائی اور ماہیت مرضی دریافتوں کی روشنی میں نہ صرف مزاج واخلاط کے نظریہ کو نکھارنے میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے بلکہ بڑی باریک بینی اور ژرف نگاہی سے ان میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

طب یونانی میں صحت و مرض کی پیدائش میں رطوبات بدن کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ امراض کے ماہیتی پہلوؤں اور ادویہ کے فعلیاتی اثر کے درمیان اخلاط اربعہ کا اصول کار فرما ہے۔ خلطی منافع الاعضاء اور خلطی مرضیات کی تشکیل میں یونانی ماہرین طب وادویہ نے جس بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے اور نفسیاتی و عضوی عوامل اور ان کے درمیان رشتوں کو ملحوظ رکھ کر جو اساس فراہم کی ہے اسے جدید سائنسی زبان میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب میں طبعیات و کیمیا، فعلیات و مرضیات اور ادویہ و علاج پر نئی معلومات کی روشنی میں اس طرح لکھا ہے کہ ان قدیم حقائق کا نقش کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ امراض یا ان کے اسباب کے مطالعہ میں بعض جگہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حکیم جمیل کا انداز روایتی نہیں آزادانہ ہے ان کے بیانات میں ندرت اور فکر انگیزی پائی جاتی ہے۔ ان کی بعض تعبیرات سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ لیکن جس سعی واہتمام سے انہوں نے نتائج کو مرتب کیا ہے، ان کی قدر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان کی علمی جستجو اور تخلیقی صلاحیت پوری کتاب میں نمایاں ہے۔ اس کام کے لئے جس میں تحقیق و تلاش کے بہت سے عنوانات سامنے آئے ہیں، میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ فکر و نظر کی دعوت کے لیے اس میں جو سامان فراہم کیا گیا ہے، شائقین طب اسے یقیناً منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

OO

تقدمہ ذخیرہ ثابت بن قرۃ

مشرق میں اسکندریہ، جندیشاپور، رہا اور حران طب کے اہم مرکز تھے۔ حرانی صابی اطباء سے طب کی شاندار روایات کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ انکے طبی اکتشافات اور فنی کارناموں نے تاریخ طب پر جو گہرے نقوش ثبت کئے ہیں وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ حرانیوں میں اگرچہ اصطفن ۴، ہارون بن ساعد بن ہارون ۵ اور دوسرے فاضل طبیب گزرے ہیں لیکن حرانی صابی اطباء کی ساری شہرت خاندان قرۃ کی بدولت ہے، جس کی وجہ سے انہے بقاء دوام حاصل ہوا۔ ثابت بن قرۃ اس خاندان کا گل سرسبد ہے۔ طب کے علاوہ جن دیگر علوم میں حرانیوں کو امتیاز حاصل تھا ان میں ہیئت بطور خاص شامل ہے۔ ابن ندیم کے مطابق مامون کے دور سے پہلے آلات رصد بھی حران میں تیار کئے جاتے تھے ۶

اس خاندان کے ممتاز طبیبوں میں ابو اسحٰق ابراہیم بن زہرون حرانی طب، منطق، فلسفہ و حکمت میں مہارت رکھتا تھا۔ ۱۹ر صفر ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء میں فوت ہوا ۷

ابو الحسن ثابت بن ابراہیم بن زہرون (۳۶۹-۲۸۳/۹۷۹-۸۹۶ء) نہایت ذی علم اور دانش مند طبیب تھا۔ تشخیص امراض اور معالجات میں اس کے کمال کے واقعات ابن القفطی ۸ اور ابن العبری ۹ نے نقل کئے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ عضد الدولہ اور عزالدولہ کے زمانے میں اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی نباضی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ طب نہیں نبوت ہے ۱۰ تصانیف میں اصلاحات مقالات من کناش یوحنا بن سرابیون اور کتاب جوابات مسائل ہیں ۱۱

ابو الحسین ہلال بن ابراہیم بن زہرون دانشمندی، حذاقت اور علاجی قابلیت میں

مطبوعہ لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ ۱۹۸۷

مشہور تھا۔ بغداد میں قیام رہا۔ اس شہر کے اعیان وامراء کے ہاں اسے بڑا رتبہ حاصل تھا۔ امیر الامراء توزون کا معالج رہا [12]

ابوالحسین ہلال کا بیٹا ابواسحٰق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن زہرون (پیدائش ۳۱۳ھ/۹۲۵ء) صاحب الرسائل کے نام سے معروف ہے۔ ریاضی، ہندسہ، ہیئت کے علاوہ زبان وادب میں مہارت رکھتا تھا۔ شرف الدولہ بن عضد الدولہ نے بغداد میں جو رصد قائم کی تھی اس میں ویجن بن رستم اور دوسرے ماہرین کے ساتھ یہ بھی شریک تھا۔ ۱۲ شوال ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں بغداد میں انتقال ہوا۔ [13]

حرانی فضلاء میں ابن وصیف صابی طب کا عالم اور اپنے زمانہ میں امراض چشم کا سب سے بڑا ماہر تھا [14]

محمد بن جابر بن سنان ابو عبداللہ حرانی المعروف بالجانی (وفات ۳۱۷ھ/۹۲۹ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رصد کواکب کی تصحیح اور ان کی حرکات کے امتحان میں اس کے مرتبہ کی اسلامی دنیا میں کوئی شخصیت نہیں پیدا ہوئی [15]

سنان بن الفتح حرانی حساب اور ریاضی میں خصوصی مہارت کے لئے مشہور تھا۔ اس موضوع پر عمدہ کتابوں کا مصنف ہے [16]

مشرق کے علاوہ ایک حرانی طبیب نے اندلس میں اموی خلافت کے بانی عبدالرحمان (وفات ۱۷۴ھ/۷۹۰ء) کے بیٹے محمد کے عہد میں اندلس میں اقامت اختیار کی تھی۔ قرطبہ میں اپنے عمدہ مجرب نسخوں کی وجہ سے اس نے بڑی شہرت پائی۔

ثابت بن قرۃ کا پورا گھرانہ اور اس کی کئی نسلیں علم وفن کی آبیاری میں مشغول رہیں۔ ابراہیم بن ثابت بن قرۃ کے بارے میں ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ اپنے باپ سے کم نہیں تھا۔ اپنے زمانے کے حاذق اور معتبر طبیبوں میں شمار کیا جاتا ہے [17]

ابوسعید سنان بن ثابت بن قرۃ، طب، ہندسہ، ہیئت، ریاضی و فلسفہ میں تبحر رکھتا تھا۔ سیاسی امور میں بھی اپنے باپ کا ہم رتبہ تھا۔ خلفاء، وزراء اور عمائدین

سلطنت اس سے مشورہ کرتے تھے۔ سنان ابتدا میں خلیفہ مقتدر باللہ (۳۲۰۔۲۹۵ھ/۹۳۲۔۹۰۷ء) کا طبیب تھا۔ اس کے بعد قاہر باللہ (۳۲۲۔۳۲۰ھ) اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹۔۳۲۲ھ/۹۴۰۔۹۳۳ء) سے وابستہ رہا۔ القاہر اس سے بہت خوش تھا۔ اس نے اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ قاہر کے اصرار پر اس کو اسلام لانا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد سنان خراسان گیا اور آخر میں بغداد واپس ہوا۔ ابن ندیم کے مطابق غرہ ذی الحج ۳۳۱ھ/۹۴۲ء میں بہ حیثیت مسلمان فوت ہوا۔ ۱۸

مقتدر کے عہد میں سنان کو نہایت درجہ عظمت و منزلت حاصل تھی اور وہ رئیس الاطباء کے منصب پر فائز تھا۔ ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں مقتدر کو اطلاع ملی کہ طبیب کے غلط علاج سے ایک مریض مر گیا۔ اس نے فرمان جاری کیا کہ کوئی طبیب اس وقت تک مطب نہیں کر سکتا جب تک سنان اس کا امتحان نہ لے اور وہ اجازت نامہ نہ عطا کرے۔ بغداد میں اس وقت جو اطباء تھے ان کی تعداد ۸۶۵ سے زیادہ تھی۔ اس لئے کہ وہ طبیب جو شہرت رکھتے تھے اور جنہیں امتحان کی ضرورت نہیں تھی اور وہ طبیب جو دربار سے وابستہ تھے وہ اس تعداد میں شامل نہیں تھے۔ ۱۹

سنان موجودہ زمانہ کی طرح صحتی امور کا ذمہ دار تھا۔ چنانچہ وزیر علی بن عیسی ابن جراح نے حکم دیا کہ اطباء قیدیوں اور دور دراز مقامات پر آباد لوگوں کے علاج کی طرف بھی توجہ دیں اور دیہاتوں اور دور دراز مقامات کے بیمار اور غریب مریض یہاں تک کہ جانوروں کا بھی علاج کریں۔ چنانچہ سنان نے اس حکم کی رو سے بہت سے ماتحت اطباء جیل خانہ جات اور دور دراز علاقوں میں متعین کئے۔ ابن قفطی نے ان واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سنان نے متعدد بیمارستان کی تاسیس میں دلچسپی لی۔ ۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں اس نے خلیفہ مقتدر باللہ کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے نام سے ایک بیمارستان قائم کرے۔ محلہ باب الشام جنوبی بغداد میں واقع یہ شفاخانہ "بیمارستان المقتدر" کے نام سے مشہور ہوا۔ دو سو دینار ماہانہ مصارف تھے۔ اسی سال کے شروع میں یعنی پہلی محرم ۳۰۶ھ کو سنان نے

خود دریائے دجلہ کے کنارے بازار یحییٰ بغداد میں بیمار ستان سیدہ قائم کیا۔ اس کے ماہانہ مصارف چھ سو دینار تھے ۲۰ خلیفہ معتضد باللہ کے سپہ سالار بدر کے قائم کردہ شفاخانہ بدری کا نظم بھی سنان کے ماتحت تھا۔ اس شفاخانہ کے اخراجات ایک وقف کی آمدنی سے پورے کئے جاتے تھے۔ سنان کو امراض عامہ کے ساتھ نفسیاتی علاج میں مہارت حاصل تھی۔ ۲۱ ہندسہ اور ریاضی میں اس کی متعدد تصانیف ہیں۔ شاگردوں میں ابوالحسن طبیب (وفات ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) مشہور ہے ۲۲

ابواسحاق ابراہیم بن سنان بن ثابت بن قرہ نہایت ذہین و ذکی اور حساب، ہندسہ اور طب کا سربرآوردہ عالم تھا۔ ان علوم میں متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ ۲۳ ۱۵ محرم ۳۳۵ھ/۹۴۶ء کو ورم جگر میں بغداد میں وفات پائی۔ تاریخ پیدائش ۲۹۶ھ/۹۰۸ء تھی ۲۴

ابوالحسن ثابت بن سنان بن ثابت بن قرۃ اپنے باپ اور دادا کی طرح مقتدر اور نامور طبیب تھا۔ خلیفہ المطیع باللہ (۳۳۴۔۳۶۳ھ/ ۹۴۵۔۹۷۳ء) کے عہد اور معزالدولہ الاقطع احمد بن بویہ کی امارت کے زمانہ میں دربار سے وابستہ رہا۔ اس سے پہلے خلیفہ راضی باللہ، خلیفہ المتقی بن المقتدر باللہ اور مستکفی باللہ کے یہاں اس نے طبی خدمات انجام دی تھیں۔ ثابت بن سنان معالجات میں دسترس کے ساتھ ہی طب کے اصول و کلیات پر گہری نظر اور مشکل کتابوں کے حل میں امتیاز رکھتا تھا۔ بغداد کے بیمارستانوں کا افسر اعلیٰ رہا۔ ۲۵ ۳۱۳ھ/۹۲۵ء میں اسے وزیر فتح بن خاقان نے ابن الفرات وزیر کے قائم کردہ بیمارستان میں متعین کیا تھا۔ اس وقت اسکی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔

بغداد میں اسکی مجلس درس کا شہرہ تھا۔ یونس بن احمد حرانی کے بیٹے احمد اور عمر نے اس سے جالینوس کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ابن ندیم اور ابن قفطی کے مطابق ۱۱ ذی قعدہ ۳۶۵ھ/۹۷۵ء میں انتقال ہوا۔ ۲۶ ابن ابی اصیبعہ نے سال وفات

۳۶۳ھ / ۹۷۳ء لکھا ہے۔ ۲۷ اور میرا خیال ہے کہ یہ صحیح ہے اس لئے کہ اس کی کتاب التاریخ کے بارے میں خود ابن قفطی کا بیان ہے کہ اس میں ۲۹۵ھ سے وفات ۳۶۳ھ تک کے واقعات شامل ہیں۔ ۲۸ ابن العبری میں بھی تاریخ وفات ۳۶۳ھ بیان کی گئی ہے۔ ۲۹

ابوالحسن بن سنان۔ دراصل ثابت بن سنان سے علاحدہ شخصیت ہے۔ بعض نے ان دونوں کو ایک خیال کیا ہے۔ اشتباہ کی وجہ ابوالحسن کنیت ہے، جو ثابت بن سنان کی بھی تھی۔ اس شخص کا اصل نام ہی ابوالحسن ہے اور یہ اس کی کنیت نہیں ہے۔ یہ شخص بغداد میں ۴۳۹ھ / ۱۰۴۷ء میں موجود تھا اور محرم ۴۳۶ھ / ۱۰۴۴ء میں اس نے ابوالحسن ہلال بن محسن بن ابراہیم کا جو معروف مورخ و مصنف ہے، علاج کیا تھا، جب کہ ابوالحسن ثابت ۳۶۳ھ میں وفات پاچکا تھا۔

ابن ندیم نے ابوالحسن ثابت بن سنان کو ابوالحسن سنان لکھا ہے ۳۰ یعنی کنیت کو بجائے نام استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد ابوالحسن ثابت متوفی ۳۶۳ھ ہے۔ غالباً یہیں سے ان ناموں میں اشتباہ واقع ہوا ہے اور ان دونوں کو ایک آدمی سمجھا گیا ہے۔ ابن قفطی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ ابوالحسن بن سنان صابی اس کنیت اور اس نام کے اس طبیب کے علاوہ دوسرا شخص ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ ثابت بن قرۃ اس کا دادا ہے ۳۱

ابن قفطی کے اس بیان سے کہ ثابت بن قرہ ابوالحسن بن سنان کا دادا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن ثابت بن سنان بن ثابت بن قرہ کا بھائی ہے۔ مجھے ان دونوں کی علاحدہ شخصیت تسلیم ہے لیکن بھائی ہونے سے مجھے اس لئے اتفاق نہیں ہے کہ ابوالحسن ثابت بن سنان نے ۳۶۳ھ / ۹۷۳ء اور اس کے دوسرے بھائی ابواسحٰق ابراہیم بن سنان نے ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں وفات پائی ہے جبکہ ابوالحسن بن سنان ۴۳۹ھ / ۱۰۴۷ء تک زندہ رہا ہے اس طرح ایک بھائی سے ۷۴ سال اور دوسرے

بھائی سے ۱۰۴ سال کا فرق واقع ہوتا ہے۔ عمر کا یہ تفاوت اس تردید کے لئے کافی ہے۔ میرے خیال میں ابن قفطی نے ثابت بن قرہ کے لئے جد کا لفظ حقیقی دادا کے معنی میں نہیں جد اعلی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ابن قفطی کی اس وضاحت سے بھی کہ "خاندان صابئہ اور طب کے مشہور گھرانہ سے اس کا تعلق ہے اور یہ آل سنان میں سے ہے" اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ابوالحسن بن سنان بیمارستان بغداد کا شیخ الاطباء (ساعور الاطباء) تھا اور معالجہ میں مہارت رکھتا تھا۔ ۴۳۹ھ / ۱۰۴۷ء میں اس نے اپنے بھائی ابوالفضل بن سنان کا علاج کیا تھا۔ یہ وہی سال ہے جس میں بکثرت امراض اور وبا عظیم پیدا ہوئی تھی ۳۲ غرس النعمۃ کے بیان کے مطابق اس کے والد ابوالحسن ہلال بن محسن کا ۴۳۶ھ / ۱۰۴۴ء میں اس نے جس کامیابی سے علاج کیا وہ طب میں اس کی منزلت پر شاہد ہے۔ اس علمی قابلیت کے باوجود اخلاق قابل ستائش نہ تھا۔ اپنے بھائی ابوالفضل اور دوسرے لوگوں سے عداوت رکھتا تھا۔

ابوالفرج بن ابوالحسن بن سنان حاذق معالج تھا۔ اپنے بزرگوں کی طرح تشخیص امراض کی صحت میں معاصرین میں منفرد سمجھا جاتا تھا۔ ۳۳

ابوالحسن بن ابوالفرج بن ابوالحسن بن سنان نہایت ذہین و فطین اور طب میں یکتائے روزگار تھا اور اس کا مرتبہ اپنے دادا ابوالحسن بن سنان سے کم نہ تھا ۳۴ بعض فضلاء نے انہیں خاندان قرہ میں شمار کیا ہے لیکن مجھے ان دونوں کی قرہ خاندان سے وابستگی میں پورا شبہ ہے۔ دراصل یہ اس تیسرے ابوالحسن بن سنان کے بیٹے اور پوتے ہیں جو بویہی سلطنت کے زمانہ میں نہایت فاضل و صاحب نظر طبیب اور ابوالحسن حرانی (ثابت بن ابراہیم بن زہرون) کا معاصر اور دوست تھا۔ اس تیسرے ابوالحسن کا ذکر ابن قفطی نے علاحدہ سے کیا ہے۔ ۳۵ یہ اس خاندان کے علاوہ دوسرے لوگ ہیں۔

طب اور طبیعی علوم کی طرح تاریخی و ادبیات میں بھی ان حرانی صابئی فضلاء کی

خدمات قابل قدر ہیں۔ سنان بن ثابت بن قرہ کی کتاب تاریخ ملوک السریانی بڑی اہم ہے۔ بویہی عہد کے نامور ریاضی داں ابوالحسن ویجن بن رستم کوہی کی فرمائش پر سنان نے اس کی تمام کتابوں کی عبارت کی اصلاح کے فرائض انجام دیئے تھے ۳۶ ابوالحسن ثابت بن سنان بھی صاحب التاریخ ہے۔ اسکی تاریخ میں ۲۹۵ھ سے وفات ۳۶۳ھ تک کے واقعات شامل ہیں۔ اس کے بھانجے ہلال بن محسن بن ابراہیم نے اس کا ذیل لکھا ہے ۳۷ ہلال بن محسن بن ابراہیم کا بیٹا غرس النعمہ محمد بھی تاریخ پر ایک کتاب کا مصنف ہے۔ ابواسحٰق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم کی کتاب التاجی فی اخبار الدولۃ الدیلمیۃ جسے اس نے عضدالدولہ کی درخواست پر لکھا تھا اور جو اس کے نام معنون ہے (عضدالدولہ کا ایک لقب تاج الملۃ بھی تھا) ۳۸ اس عہد کی معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے۔

ابوالحسن ثابت بن قرۃ (بن مروان بن ثابت بن کرایا بن ابراہیم بن کرایا بن مارینوس بن سالامانس ۳۹) نہ صرف بے مثل معالج، مترجم، مصنف بلکہ مہندس اور منجم کی حیثیت سے نہایت ممتاز شخصیت ہے۔ حران میں صرافی کے پیشہ سے وابستہ تھا۔ محمد بن موسیٰ بن شاکر سفر روم سے واپسی پر اسے اپنے ہمراہ بغداد لایا جہاں دربار خلافت میں اسے باریاب ہونے کا موقع ملا۔ ابن ابی اصیبعہ کے مطابق خلیفہ موفق باللہ نے اپنے بیٹے معتضد کو جب اسماعیل بن بلبل کے گھر نظربند کیا تو اسماعیل کی فرمائش پر ثابت دلبستگی کی خاطر روزانہ تین مرتبہ معتضد کے پاس جاتا اور اس سے دلچسپ علمی گفتگو کرتا۔ رہائی کے بعد معتضد سریر آرائے خلافت ہوا تو ثابت کو سربلندی نصیب ہوئی۔ تقرب کا یہ عالم تھا کہ دربار میں وہ بے تکلف خلیفہ کے پاس بیٹھتا تھا۔ جب کہ سپہ سالار بدر اور وزیر سب کھڑے رہتے تھے ۴۰ ابن العبری نے خلیفہ کے ہاں اس کی منزلت کے بارے میں لکھا ہے کہ دیر تک خلیفہ سے اسکی گفتگو اور مذاق کا سلسلہ رہتا تھا اور وزراء اور دوسرے خواص سے زیادہ اس کی حیثیت تھی ۴۱ بیہقی اور ابن ابی اصیبعہ کی روایت کے مطابق ایک روز وہ خلیفہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں ٹہل رہا تھا اچانک خلیفہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے اوپر سے الگ کر لیا۔ ثابت

گھبرایا۔ خلیفہ نے کہا کہ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ کے اوپر تھا علماء کی شان اس سے بلند ہے اور علماء پر بلندی نہیں حاصل کی جاسکتی ۲ ہے ثابت کے احترام میں یہ بھی ملتا ہے کہ معتضد اس کو بعض اوقات اس کی کنیت سے پکارتا تھا۔ یہ بات بہت اہم تھی کیونکہ دوسرے غیر مسلم یہ امتیاز نہیں رکھتے تھے۔

ثابت کی فنی مہارت کے تعلق سے بہت سے واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں۔ ان میں بہت مشہور روایت ہے ابن قفطی نے ابوالحسن ثابت بن سنان کے حوالہ سے نقل کی ہے، یہ ہے کہ ایک روز وہ خلیفہ معتضد کے دربار میں جارہا تھا، راستے میں اس نے لوگوں کا شور سنا، معلوم ہوا کہ قصاب کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ ثابت نے اس کے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی گھر پہنچنے پر عورتوں کو آہ وبکا کرتے دیکھ کر اس نے انہیں گریہ سے روکا اور ایک آدمی سے فوراً قصاب کے ٹخنوں پر لکڑی مارنے کو کہا اور خود اسکی نبض دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کا منہ کھول کر ایک دوا حلق میں ڈالی۔ قصاب نے آنکھیں کھول دیں۔ سارے شہر میں علاج کی دھوم مچ گئی۔ خلیفہ نے اس مسیحائی کے بارے میں دریافت کیا۔ ثابت نے بتایا کہ میں روز دربار میں آتے وقت اس قصاب کو کچی کلیجی نمک چھڑک کر کھاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس عادت کی وجہ سے میرا اندازہ تھا کہ یہ ضرور سکتہ میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ میں نے سکتہ کی دوا تیار کر رکھی تھی۔ ٹخنہ پر ضرب لگانے سے اس کی نبض میں حرکت پیدا ہوئی۔ ثابت کی ذہانت اور تیز فہمی کی یہ بہترین مثال ہے۔

سری الرفا. شاعر نے ثابت کے علاج سے شفایابی کے بعد اس کی شان میں قصیدہ کہا تھا۔

هل للعليل سوى ابن قرة شافی   بعد الاله وهل له من كل كافی
احى لنا رسم الفلا سفة الذى   اودى واوضح رسم طب عافی
فكانه عيسى بن مريم ناطقا   يهب الحياة بأيسر الاوصاف

"کیا بیمار کو شفا دینے والا خدا کے بعد ابن قرۃ کے علاوہ اور کوئی ہو سکتا ہے۔ اور کیا

مریض کی ضرورتیں اس کے سوا کوئی دوسرا پوری کر سکتا ہے۔

اس نے فلاسفہ کے طریقہ کو زندہ کیا۔ اور وہی ہے جس نے شفا بخش طب کے نقوش واضح کئے۔

"گویا وہ عیسیٰ بن مریم ہے جو اپنے معمولی نسخوں کے ذریعہ زندگی بخشتا ہے۔"

ابن خلکان کا کہنا ہے کہ سری الرفاء کے یہ اشعار ابراہیم بن ثابت کی شان میں ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے مطابق شاعر نے یہ اشعار ثابت بن سنان بن ثابت بن قرہ کی مدح میں لکھے ہیں۔ ۴۳ لیکن ابن خلکان کے یہ دونوں بیانات حقیقت سے قریب نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ابراہیم بن ثابت اور ثابت بن سنان فلسفہ میں کوئی مہارت نہیں رکھتے تھے۔ جب کہ دوسرے شعر میں شاعر نے فلسفہ طب میں اپنے ممدوح کے مرتبہ کمال کی ستائش کی ہے۔ ثابت بن قرہ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ میں خاص شہرت رکھتا تھا اور اسی لئے ابن قفطی کا بیان ہے کہ فلسفہ اس پر غالب تھا۔ ۴۴ ابن خلکان کے اس بیان کی دوسرے مورخین نے تائید نہیں کی ہے۔ الگوڈکا بھی کہنا ہے کہ یہ اشعار ثابت بن قرہ کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ۴۵

ثابت کی شہرت کی اصل وجہ اس کی اعلیٰ ترجمہ نگاری ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اسلامی عہد کے مترجمین میں جن چار ترجمہ نگاروں کو سب سے فائق قرار دیا ہے ان میں حنین بن اسحاق اور یعقوب بن اسحاق کندی کے بعد تیسرا نام ثابت بن قرہ اور چوتھا نام عمر بن فرخان طبری کا لیا ہے ۴۶ اس کے مربی بنو شاکر جو اپنے علمی کاموں اور علمی سرپرستی میں مشہور ہیں ان سے وابستہ مترجمین میں ثابت بن قرہ کے علاوہ حنین بن اسحاق بھی شامل ہے۔ یہ دونوں بنو شاکر کی طرف سے پانچ سو روپیہ ماہانہ اشرفیاں پاتے تھے۔ ابن ندیم کے مطابق ثابت نے ان کے لئے فلسفہ کی متعدد کتابوں کے ترجمے کئے ہیں۔ ۴۷

ثابت نے حسب تصریح ابن ابی اصیبعہ ۲۸۸ھ/۹۰۰ء میں ۷۶ سال بغداد میں وفات پائی۔ وہ جمعرات ۲۱ صفر ۲۱۱ھ/۸۲۶ء میں حران میں پیدا ہوا تھا۔ ۴۸ ابن

قفطی نے سال پیدائش ۲۲۱ھ/۸۳۶ء اور تاریخ وفات جمعرات ۲۶/صفر ۲۸۸ء لکھی ہے۔۴۹ ابن ندیم نے ۲۲۱ھ اور ۲۸۸ھ لکھنے کے بعد عمر ۷۷ سال بیان کی ہے۔۵۰ جبکہ اس کی درج کردہ تاریخوں کی رو سے عمر ۶۶ سال نکلتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سال پیدائش ۲۱۱ھ ہی ہے جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے۔۷۷ سال اسی کے لحاظ سے بر آمد ہوتے ہیں۔ابن ابی اصیبعہ کے ہاں جمعرات ۲۱ صفر تاریخ پیدائش کے طور پر اور ابن قفطی کے ہاں جمعرات ۲۶ صفر تاریخ وفات کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ اس طرح ایک نے سنہ وفات بغیر تاریخ اور دوسرے نے سنہ پیدائش بغیر تاریخ درج کیا ہے۔یہ بھی اپنی جگہ محل نظر ہے۔

ثابت کے بکثرت تلامذہ میں عیسی بن اسید مشہور ہے۔۵۱ یہ سریانی سے عربی میں متعدد کتابوں کا مترجم ہے۔اس کی ایک کتاب جوابات ثابت لمسائل عیسی بن اسید ہے۔۵۲

مختلف علوم و فنون میں کثیر التعداد کتابیں ثابت کی یادگار ہیں۔ طب کے علاوہ دیگر علوم میں اس کی کتابوں کی تعداد سو تک متجاوز ہوتی ہے۔ابن ندیم نے چودہ کتابوں کے نام پیش کئے ہیں جن میں پانچ کتابیں طب پر ہیں۔۵۳

۱۔کتاب الحصی المتولد فی الثانہ (المتولد الکلی والمثانہ۔اصیبعہ)

۲۔کتاب وجع المفاصل والنقرس

۳۔کتاب فی البیاض الذی یظہر فی البدن

۴۔جوامع لکتاب جالینوس فی الادویۃ المفردۃ

۵۔رسالہ فی الجدری والحصبہ

ابن قفطی کے ہاں ابن ندیم کی بیان کردہ پانچ طبی کتابوں میں سے چار کتابیں مذکور ہیں۔رسالہ فی الجدری والحصبہ کا قفطی نے ذکر نہیں کیا ہے۔(اصیبعہ کے یہاں ہے) قفطی نے جو مزید کتابیں بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۶۔رسالہ فی الصفراء واصنافہ وعلاجہ (کتاب فی الصفرۃ العارضۃ للبدن وعدد اصنافہا

واسبابہا وعلاجہا۔ (اصیبعہ)

۷۔ رسالہ فی السکون بین حرکتی الشریان

یہ رسالہ سریانی زبان میں لکھا تھا۔ عیسی بن اسید نے عربی میں ترجمہ کیا۔ ابن کرنیب نے اس کارد لکھا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کے یہاں اس کا نام "کتاب فی الوقفات التی فی السکون الذی بین حرکتی الشریان المتضادین" تحریر ہے۔

۸۔ رسالہ فی النبض

۹۔ رسالہ فی تشریح بعض الطیور

۱۰۔ رسالہ فی صفۃ کون الجنین

۱۱۔ رسالہ فی المولودین لسبعۃ اشہر

۱۲۔ کتاب الذخیرۃ فی علم الطب

۱۳۔ اختصار کتاب حیلۃ البرء

۱۴۔ اختصار کتاب جالینوس فی الاغذیہ (فی القوی الاغذیہ۔ اصیبعہ)

۱۵۔ کتاب الی ابنہ سنان فی الحث علی تعلیم الطب والحکمۃ

۱۶۔ کتاب فی مسائلۃ الطبیب العلیل (مسائلۃ الطبیب للمریض۔ اصیبعہ)

۱۷۔ کتاب فی اختصار ایام البحران لجالینوس

۱۸۔ مختصر فی الاسطقسات لجالینوس

۱۹۔ جوامع لکتاب بقراط فی الاہویۃ والمیاہ والبلدان (جوامع تفسیر جالینوس لکتاب البقراط فی الاہویۃ والمیاہ والبلدان۔ اصیبعہ)

۲۰۔ جوامع لکتاب جالینوس فی الاعضاء الآلمۃ

۲۱۔ کتاب فی اجناس ما تنقسم الیہ الادویۃ

۲۲۔ کتاب فی اجناس ما توزن بہ الادویۃ

۲۳۔ (الف) جوامع لکتاب جالینوس فی الذبول والادویۃ المنقیہ والمرۃ السوداء و سوء المزاج المختلف و تدبیر الامراض الحادۃ علی رائ بقراط۔

ابن ابی اصیبعہ نے اس کی کل ۱۴۲ کتابوں کے نام گنائے ہیں جن میں ۴۳ طب کی کتابیں ہیں۔ ابن ندیم اور ابن قفطی پر درج ذیل کتابوں کا اضافہ ہے۔

۲۳(ب) جوامع کتاب جالینوس فی الادویۃ المنقیۃ

۲۴۔ جوامع کتاب المرۃ السوداء لجالینوس

۲۵۔ جوامع کتاب سوء المزاج المختلف لجالینوس

۲۶۔ جوامع کتاب الامراض الحادہ لجالینوس

یہ چار کتابیں جنہیں ابن قفطی نے ایک کتاب کے طور پر بیان کیا ہے ابن ابی اصیبعہ کے ہاں علاحدہ حیثیت سے مذکور ہیں۔ چونکہ جالینوس کی بھی الگ الگ ناموں سے یہ کتابیں ہیں اس لئے ابن ابی اصیبعہ کا انہیں علاحدہ کتابوں کے بطور شمار کرنا صحیح ہے۔ اس طرح شمارہ ۲۳(الف) کو نا قابل شمار سمجھنا چاہئے۔

۲۷۔ لیکن یہاں "جوامع کتاب الذبول لجالینوس" کے نام سے ثابت کی ایک اور کتاب کا میں نام لینا چاہوں گا۔ ثابت نے جالینوس کی کتابوں پر جوامع کے نام سے جو کام کیا ہے ان میں پانچ کتابوں کو ابن قفطی نے ایک نام سے یاد کیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے انہیں بجا طور پر الگ الگ نام دیئے ہیں۔ لیکن جوامع کتاب الذبول کا ذکر ابن ابی اصیبعہ سے رہ گیا ہے۔ ابن ندیم کے مطابق کتاب الذبول جالینوس کی تصانیف میں ہے۔ ۵۴

۲۸۔ جوامع جالینوس فی تشریف صناعۃ الطب۔ غالباً یہ وہی کتاب ہے جسے ابن ابی اصیبعہ نے کتاب الخاصۃ فی تشریف صناعۃ الطب و ترتیب اھلھا کے نام سے جدا کتاب کے طور پر لکھا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کے ہاں کتاب فی سوء المزاج المختلف اور کتاب فی تدبیر الامراض الحادہ کی دو بار اور کتاب وجع المفاصل والنقرس کی تین بار تکرار ہوئی ہے۔

۲۹۔ جوامع کتاب النبض الصغیر لجالینوس

۳۰۔ جوامع کتاب النبض الکبیر لجالینوس

۳۱۔ جوامع کتاب الکرۃ لجالینوس (جالینوس کی کتاب الریاضۃ بالکرۃ الصغیر، اور

کتاب الریاضۃ الکرۃ الکبیرۃ ہیں (مجھے اس کے طبی کتاب ہونے میں شبہ ہے)

۳۲۔ جوامع کتاب تشریح الرحم لجالینوس

۳۳۔ جوامع کتاب الفصد لجالینوس

۳۴۔ کتاب فی اجناس ما تقسم بہ الادویۃ (شمارہ ۲۱ اور ۲۲ کے علاوہ تیسری کتاب ہے)

۳۵۔ کتاب اصناف الامراض

۳۶۔ کتاب مسائلۃ الطبیۃ

۳۷۔ کتاب فی تدبیر الصحۃ

۳۸۔ کتاب فی وصف القرص

۳۹۔ کتاب البصر والبصیرۃ فی علم العین وعللہا ومداواتہا۔

شمارہ ۲۸ کے تحت جیسا کہ میں نے لکھا ہے پانچ کتابوں کی تکرار ہے۔ اس لیے ابن ابی اصیبعہ کی بیان کردہ کتابیں ۴۳ کے بجائے ۳۸ رہ جاتی ہیں اور یہ وہ تعداد ہے جس پر دوسرے مورخین کے ہاں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ گویا ۳۸ کتابیں ثابت کی یادگار ہیں جن کی مکمل فہرست ابن ابی اصیبعہ کے ہاں پیش کی گئی ہے۔ ان میں جوامع کتاب الذبول کے اضافہ سے ثابت کی مکمل طبی تصانیف کی تعداد ۳۹ قرار پاتی ہے۔

مختصر ثابت بن قرۃ لکتاب جالینوس فی المولودین لسبعۃ اشہر کے نسخہ مخزونہ ایا صوفیہ استنبول کا متن اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسن نئی دہلی میں ارسلا وایزر (Ursula veisser) نے مارچ ۱۹۸۲ء میں شائع کیا ہے۔ یہ پانچ صفحات کا رسالہ ہے۔ فواد سیزگن کی اطلاع کے مطابق اس کا دوسرا نسخہ اسٹیٹ پبلک لائبریری لینن گراڈ میں ہے۔

کتاب الذخیرۃ فی الطب معالجات میں ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ ابن قفطی اور ابن ابی اصیبعہ نے اسے کناش کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ ثابت بن قرۃ کی طرف اس کا انتساب ابن قفطی کے نزدیک مشتبہ ہے۔ ثابت بن سنان کے حوالہ سے اس نے نقل کیا ہے کہ یہ کتاب ثابت بن قرہ کی نہیں ہے۔[۵۵]

لیکن دوسرے مصنفین کے ہاں اس قسم کے کسی شک کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اسے ثابت کی کتاب تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ثابت بن قرہ نے یہ کتاب اپنے بیٹے سنان کے لیے تالیف کی ہے۔[۵۶] نظامی عروضی سمرقندی کے مطابق ذخیرہ ثابت بن قرہ طب کی ان اہم ترین کتابوں میں ہے جن کا مطالعہ ایک طبیب کے لیے نہایت ضروری ہے۔[۵۷]

ہو سکتا ہے قفطی کی روایت درست ہو لیکن کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یہ ذخیرہ جو ثابت بن قرہ کے نام سے موسوم ہے کوئی بعد کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کی قدامت بہر حال مسلم ہے۔ اس کے پوتے ثابت بن سنان نے جس کا حوالہ ابن قفطی نے پیش کیا ہے، ۳۶۳ھ / ۹۷۳ء میں وفات پائی ہے۔ اس کے زمانے میں یہ کتاب موجود تھی۔ اس کا شمار بہر حال یقینی طور پر طب کی ان کتابوں میں ہے جو ابن سینا سے کافی پہلے لکھی گئی تھیں۔

یہ محض دور ترجمہ کی یادگار اور کسی قدیم یونانی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ معالجات پر ایک مکمل تصنیف ہے۔ جسے یونانی اور عرب اطباء کی تصانیف، تجارب اور ذاتی معلومات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے بھی ایک اہم تالیف ہے کہ اس کے صفحات کے ذریعے بعض قدیم کتابوں کی عبارتیں محفوظ نظر آتی ہیں۔ جگہ جگہ اس نے اطباء قدیم کی کتابوں سے سند حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر جارج صبحی کے زیر اہتمام ۱۹۲۸ء میں یہ قاہرہ سے طبع ہوئی ہے۔

اکتیس مقالات پر مشتمل اس کتاب کی ابتدا حفظان صحت سے کی گئی ہے۔ دوسرے مقالہ سے امراض کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اسباب و علامات پر اجمال سے اور علاج پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ مفرد اور مرکب دونوں قسم کی دوائیں درج ہیں۔ اگرچہ کم اجزا کے مرکبات استعمال کئے گئے ہیں لیکن بہت سے ایسے مرکبات ہیں جن کی دواؤں

کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثلاً ضعف معدہ میں معجون ہندی کا نسخہ ۱۰۳ دواؤں پر مشتمل ہے۔ غذائیں بھی تجویز کی گئی ہیں اور اغذیہ وادویہ مناسبہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امراض سے قبل اعضاء کی تشریح کا بیان ہے۔ بعض جگہ منافعائی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اعمال جراحیہ بھی مندرج ہیں۔ ناخونہ کے علاج میں عمل کشیط مخصوص جراحی عمل بیان کیا ہے۔ ضربہ وسقطہ، کسر وخلع، اسی طرح امراض وبائیہ اور سموم وتریاقات پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔

۱۹۶۵ء میں دیوبند کے علمی سفر میں جب وہاں کے کتب خانہ کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا تو سب سے زیادہ جس مخطوطہ نے میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا وہ ذخیرہ ثابت بن قرہ تھا۔ اس کے ترجمہ واشاعت کے لیے میرا شوق بھڑکا اور میں اس گنج گراں مایہ کے لیے بے چین ہوا۔ مخطوطہ سے استفادہ کے لیے دیوبند قیام ضرور تھا۔ اتفاق سے اس کے کچھ ہی دن بعد صدیق فاضل حکیم سید ایوب علی کا دارالعلوم دیوبند کے جامعہ طبیہ میں بحیثیت استاد آنا ہو گیا۔ وہ اس کے واسطے نہایت مناسب اور موزوں شخص تھے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے میری خواہش پر اسے اردو جامہ پہنانے کا تہیہ کیا۔ دیوبند کے قیام میں وہ اس کا ترجمہ مکمل کر چکے تھے۔ دہلی سے میری ادارت میں شائع ہونے والے مجلّہ الحکمت میں اپریل ۱۹۶۷ء سے ستمبر ۱۹۷۰ء تک اس ترجمہ کی ۳۳ قسطیں طبع ہوئی تھیں۔ اگست ۱۹۶۷ء میں مشہور طبی مورخ ڈاکٹر سائرل الگوڈ (وفات ۲۹/ مارچ ۱۹۷۰ء) سے دہلی میں ملاقات کے دوران ذخیرہ ثابت بن قرۃ کا تذکرہ آیا اور مصر سے اس کی اشاعت کا پتہ چلا۔ میں اس نسخہ کا متلاشی رہا کچھ عرصہ بعد کتب خانہ جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں اس کی موجودگی کی اطلاع ملی اور اسے دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ بعد میں جب حکیم سید ایوب علی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے حیدر آباد کے نسخہ سے جو ہندوستان میں اس کا دوسرا دستیاب مخطوطہ ہے اور مصر کے مطبوعہ نسخہ کی عبارتوں سے ترجمہ کی تصحیح کا کام انجام دیا۔ چند در چند وجوہ سے اس ضخیم ترجمہ کی طباعت ملتوی ہوتی رہی، خدا کا شکر ہے

اب اس کی طباعت عمل میں آرہی ہے۔

حکیم سید ایوب علی شعبہ علم الادویہ میں ریڈر ہیں اور طب اور عربی زبان کا اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ اس ترجمہ میں انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس کا شمار اردو میں طب کے اہم علمی تراجم میں کیا جائے گا اور قدیم کتابوں کی اشاعت اور تراجم کے سلسلے کو وسعت دینے میں ان کی یہ کاوش قدر واستحسان کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

۵ر فروری ۱۹۸۷ء

OO

تقدمہ بخاروں کا علاج (حصہ اول)
علاج امراض جلد (حصہ دوم)

موجودہ طبی نصاب میں معالجات سال پنجم کا نصاب حمیات، امراض جلد، مفاصل، شعر و ظفر و اسنان پر مشتمل ہے۔ حمی اگرچہ مستقل بالذات مرض نہیں ہے، یہ دوسرے عوارضات کے نتیجہ میں ظہور میں آتا ہے۔ ابن سینا نے حمی دق کو پھیپھڑہ کا عرض قرار دیا ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر حمیات کو طب یونانی میں معالجات کا ایک علیحدہ عنوان قرار دیا جاتا رہا ہے۔ یونانی عہد میں معالجات کے ایک اہم شعبہ کے بطور اس کا مطالعہ شروع ہو گیا تھا۔ جالینوس کی تصانیف میں کتاب الحمیات، رسالہ بحران اور رسالہ فی ایام بحران اس موضوع کی طرف خصوصی التفات کا اظہار ہیں۔ یہ جوامع الاسکندرانیین یعنی اطباء اسکندریہ کی مرتب کردہ جالینوس کی سولہ درسی تصانیف کے مجموعہ میں بھی شامل ہیں۔ جسے عربی عہد تک طبی نصاب کے طور پڑھایا جاتا تھا۔

عربی مصنفین نے بشمول محمد بن زکریا رازی اور ابن سینا حمیات کو موضوع بنا کر قلم اٹھایا ہے۔ ابتداء میں معالجات کی کتابوں کے ایک حصہ کے طور پر اس پر تفصیلات پیش کی گئیں۔ بعد میں اس پر مستقل کتابیں تصنیف ہوئیں۔ کتاب الحمیات اسحٰق بن سلیمان اسرائیلی، رسالہ فی الحمیات علی بن محمد بن علی افزاری، رسالہ فی الحمی واقسامہا محمد بن ابراہیم، رسالہ فی الحمی واقسامہا سیوطی، غایت الفہوم فی تدبیر الحموم اسحٰق خاں، اسرار العلاج و سراج الوہاج (تعلیقات علی حمیات قانون ابن سینا) مرزا علی شریف کے علاوہ فارسی میں رسالہ در حمیات مرکبہ مولانا رستم جرجانی، معالجات حمیات محمد باقر، رسالہ در بحث حمیات حکیم صادق علی خاں، رسالہ حمیات حکیم سید حیدر علی، رسالہ

علاج حمی صفراوی حکیم محمد صادق رضوی، رسالہ حدود الحمیات حکیم میر محبوب علی، دستور العمل حمیات حکیم محمد محسن خیر آبادی (بھوپال) قابل ذکر ہیں۔

بحران حمی ہی کا ایک رد عمل ہے۔ اسے بھی طب یونانی میں موضوع بنا کر کام کیا گیا ہے۔ یونانی ذخیرہ میں خاصا مواد اس کے تعلق سے موجود ہے۔ رسالہ بحرانیہ محمد تقی شیرازی، شرح رسالہ بحرانیہ شاہ حسین ازدی اور فارسی میں رسالہ در بحران سید قطب الدین، رسالہ بحران حکیم احمد اللہ مدراسی وقیع کام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں حکیم اصغر حسین فرخ آبادی (افسر الاطباء بھوپال) نے دستور النجات عن مصائب الحمیات، منتہی البیان فی تحقیق البحران، حکیم محمد حسن حاذق نے رسالہ تپ، حکیم نور احمد صابر گوالیاری نے معلم حمیات (منظوم) حکیم شکیل احمد شمسی نے رسالہ حمیات اور رسالہ بحران (قانون کی تلخیص) اور حکیم مرزا نور بیگ نے حمیات کے ذریعہ اس سلسلہ کو آگے بڑھایا ہے۔

امراض جلد نے معالجات کے ایک خصوصی شعبہ کی حیثیت سے گزشتہ صدی میں بڑی اہمیت اختیار کی ہے۔ اس کا خصوصی مطالعہ معالجات کا ایک اہم موضوع بن چکا ہے۔ ان بیماریوں کا صرف دائرہ ہی نہیں بڑھا ہے ان کے پھیلاؤ میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ جلد کے مختلف امراض میں مبتلا مریضوں کی تعداد کا تناسب دوسرے نظام کے امراض کے مقابلہ میں تشویشناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ جلد کے ان کثیر الوقوع امراض پر طب یونانی میں خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور اس کو موضوع بنا کر ابھی تک کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں دیا گیا ہے۔

اسی طرح معالجہ و جراحت اسنان میں موجودہ طبی سائنس نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور یہ شعبہ ایک امتیازی حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ طب یونانی میں اس شعبہ کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یونانی ذخیرہ میں نہ صرف ان شعبوں بلکہ معالجات کے دیگر شعبوں کے تعلق سے جو سرمایہ ہے اس کی تلاش و تحقیق پر اگر ہمارے محققین کی کوششیں صرف ہوں تو دامن فن قابل قدر مفید معلومات سے بھرا نظر آئے گا اور جواہر آبدار جو خود ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، انہیں دنیائے طب کے سامنے پیش

کر کے ہم ایک اہم طبی خدمت سے سبکدوش ہو سکیں گے۔ امراض جلد اور امراض اسنان کی ایک مکمل فہرست تیار کر کے یونانی نقطہ نظر سے ان کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کے اسباب پر تحقیقی نظر اور یونانی معالجہ کی کتابوں میں اگر ان کے تعلق سے کچھ واضح یا مبہم اشارے دوسرے امراض کے ذیل میں کئے گئے ہیں تو ان کی جمع و ترتیب اور تنقیح و تہذیب اور پھر مفردات کے ذخیرہ سے ایسی ادویہ کی تلاش جو اس سلسلہ میں افادیت کی حامل ہوں۔

بعض دوسرے نظام کی بیماریوں کی طرح جلد اور اسنان کی بہت سی ایسی بیماریاں سامنے آئی ہیں، جن کا طب کی قدیم کتابوں میں تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن یونانی اصول علاج اور یونانی ذخیرہ میں موجود ادویہ مفردہ کے افعال کلیہ کی روشنی میں ان امراض کا شافی علاج تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ادویہ جلدیہ پر کام کے لیے تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے شعبہ علم الادویہ علی گڑھ کے ایک نوجوان طبیب کی توجہ میں نے منعطف کرائی ہے۔ اگر یہ تحقیقی کام انجام پایا تو یونانی میں جلدی دواؤں کے تعلق سے یہ ایک بڑے کام کا آغاز ہوگا۔

ایک زمانہ تک معالجات میں نصابی کتابوں کی بڑی کمی رہی اور شرح اسباب کے اردو تراجم کے سوا معالجات کی سلیقہ سے مرتب کردہ کتاب طلبہ کی نصابی ضرورت کے مطابق سامنے نہیں آسکی۔ گزشتہ دو دہائیوں میں متعدد کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ ان میں حال ہی میں شائع ہونے والی بعض کتابیں مثلاً امراض زہریہ حکیم سمیع الرحمٰن خاں، امراض راس حکیم الطاف احمد اعظمی، امراض النساء اور امراض العین حکیم شفقت اعظمی، بچوں کا علاج حکیم عبدالجلیل، امراض نسواں اور امراض اطفال اور امراض اذن و انف و حلق حکیم وسیم احمد جدید معیاری تقاضوں کے مطابق ہیں اور انہیں مضمون پر گرفت اور عالمانہ نظر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

پیش نظر کتاب بخاروں کا علاج (حصہ اول) اور علاج امراض جلد (حصہ دوم) نصاب کے روایتی انداز پر ہے۔ شروع میں اسباب و علامات سے مختصر مفید بحث کے بعد حمیات کا عام بیان ہے۔ حمیات میں بعض ایسے بخاروں کا اضافہ ہے، جن کا یونانی کتابوں میں ذکر نہیں ہے۔ مثلاً مرض النوم جو بعض افریقی ملکوں کا مخصوص بخار ہے۔ اسی طرح

داء الخنزیر سور کا گوشت کھانے والوں میں لاحق ہوتا ہے۔ ان کا علاج یونانی اصولوں کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اسی انداز پر دوسرے غیر مدونہ یا موجودہ سماج وعادات کے زیر اثر نئے پیدا ہونے والے امراض کا اضافہ یونانی معالجات کی کتابوں میں کیا جانا چاہئے۔ اس کتاب میں علاج کے بیان میں محض کتابی دواؤں پر اکتفا نہیں کیا ہے، اس حصہ کو معمولات مطب اور ایسی ادویہ کے بیان سے آراستہ کیا ہے، جنہیں واقعی ان امراض میں استعمال کر کے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ معالجات کی اکثر کتابوں کا علاجی بیان ایسا کمزور ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ مطب و معالجہ میں کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہوا جاسکتا۔ قانون ابن سینا کے معالجاتی حصہ کے بارے میں بھی یہی شکایت رہی ہے۔ معالجات کی کتاب کو مطب میں کام آنے والی کتاب ہونا چاہئے۔ یہ خصوصیت اس کے واسطے بہت ضروری ہے۔ کار آمد اور تجربہ شدہ دوائیں جو حاذق اطباء کے معمولات میں شامل ہیں اور جنہیں تجربات، معمولات اور بیاض کی قسم کی کتابوں میں درج کیا گیا ہے، ذاتی تجربات کے علاوہ وہاں سے اگر نسخوں کا انتخاب کیا جائے تو یہ حصہ وقیع بن سکتا ہے۔ معالج مصنف کے تجربات اور کامیابیوں کا خلاصہ۔

مولف کتاب حکیم محمد شعیب قاسمی دار العلوم دیوبند کے فارغ ہیں۔ طب کی تعلیم انہوں نے ہمدرد طبی کالج دہلی سے حاصل کی ہے۔ ۱۹۸۱ء سے راجپوتانہ طبیہ کالج جے پور سے وابستہ ہیں اور کچھ عرصہ سے پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہیں مطب و معالجہ سے دلچسپی ہے۔ تدریسی و انتظامی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے پابندی سے مطب کرتے ہیں۔ ان کی یہ کاوش ایک اچھی تالیفی شروعات ہے۔ امید ہے نظر ثانی کے بعد دوسری اشاعتوں میں اسے مزید نکھارا جائے گا۔ اور بعض بیانات میں جو اختصار ہے اسے ضروری تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ متعلقہ مضمون کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے میں یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

۱۴ر مئی ۱۹۹۲ء

OO

تقدمہ اوراق پارینہ

(نسخہ ہائے ذیابیطس)

مطب اور نسخوں پر مشتمل بہت سی کتابیں اردو میں مرتب کی گئی ہیں۔ ہندوستانی طبیبوں کا یہ ایک دل پسند موضوع رہا ہے۔ عربی و ایرانی مصنفین نے اگرچہ اس پر قلم اٹھایا ہے، لیکن قدیم ذخیرہ میں ان کتابوں کی تعداد اس قدر زیادہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں حاذق معالجین نے اپنے آزمودہ نسخوں کو یا خود ترتیب دیا ہے یا ان کے تلامذہ نے ان کے مطب میں مستعمل تجربہ شدہ دواؤں کو قلم بند کیا ہے۔ اس قسم کے مجموعوں میں عموماً بلحاظ امراض محض نسخے پیش کرنے کو کافی سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان کے مواقع استعمال، مرض کے درجات، عوارضات اور دوسری کیفیتوں کی تفصیل درج نہیں کی گئی ہے۔ نسخوں کی کامیابی کا اصل انحصار ان کے برمحل اور مناسب موقع استعمال پر ہوتا ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص اور اس کے ساتھ لاحق عوارض کا لحاظ کئے بغیر اگر دوا تجویز کی جائے گی تو اس کے مفید اور قرار واقعی نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ ایک مریض پر اس کی مخصوص مرضی صورتحال کے مطابق جس دوا کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے وہ اسی وقت دوسرے مریض کے لیے موثر ثابت ہوگی جب وہ قریب قریب انہی عوارضات کے ساتھ اس مرض میں مبتلا ہو۔ سادہ اور مختلف آفتوں سے خالی بہت کم مریض سامنے آتے ہیں۔ کتابی اور مقررہ علامات کے علاوہ بیشتر مریضوں میں اتنی پیچیدگیاں ملتی ہیں کہ تشخیص تک میں دشواری پیش آتی ہے۔

محمد بن زکریا رازی پہلا شخص ہے جس نے کلینکی مشاہدات اور قصص و حکایات مرضا کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا۔ اور احوال مرض کی تفصیل کے ساتھ اپنے

طبی تجربات اور علاجی واقعات منضبط کیے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی کا 'مطب عملی' اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ افادات اور رموز مطب کے طرز پر جو کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں وہ بھی اس سلسلے کی قابل قدر کوششوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔

عام امراض کے نسخوں پر مشتمل جہاں کثرت سے کتابیں دستیاب ہیں، وہاں کسی خاص مرض کو بنیاد بنا کر اس کے مفید نسخوں پر زیادہ کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں۔ معالجین اور صاحب مطب طبیبوں کو بکثرت مریضوں کے معائنہ کی وجہ سے تجربات کے بہت مواقع میسر آتے ہیں، وہ اگر اس کا اہتمام کریں تو مخصوص مرض کی ادویات یکجا کر سکتے ہیں۔ ان کی اس کوشش سے نہ صرف ادویہ اور معالجات کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہو سکتا ہے، بلکہ معالجین اور محققین کو ایک جگہ دستیاب مواد کی سہولت فراہم ہو سکتی ہے۔

حکیم افتخار احمد نقوی نے موجودہ عہد کے کثیر الوقوع مرض ذیابیطس پر طبی کتابوں میں مذکور نسخوں کے ساتھ اپنے اساتذہ کے معمولات کو کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ اس کے ذریعہ طب یونانی کے ذخیرہ میں موجود اس مرض کی تقریباً ساری مروجہ و معمول بہا دوائیں یکجا ہو گئی ہیں۔ روایتی دواؤں کے علاوہ، اس میں بعض ایسی دوائیں بھی پیش کی گئی ہیں جن کا ذیابیطس میں استعمال طبی کتابوں میں درج نہیں ہے۔ لیکن وہ اطباء کے معمولات میں شامل ہیں۔ اس قسم کی دواؤں میں برگ زنجبیل، برگ اڑوسہ، گل ہار سنگھار، پوست درخت جنگلی جلیبی، لاجونتی، کلونجی، حب القلت، مکئی کے بھٹوں کے بال، بادام تلخ، بابونہ، ہلدی، حرمل وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ دوائیں ہمیں دعوت فکر و تحقیق دیتی ہیں۔ ان پر تجرباتی اور کلینکی طور پر کام کی ضرورت محسوس کرنا چاہئے۔

حکیم افتخار احمد نقوی کو اپنے گھر کے علمی ماحول کے علاوہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ اور اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا۔ مجھے خوشی ہے کہ دوران تعلیم ان میں جو علمی ذوق اور یونانی معالجہ سے رغبت کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا، اس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوا اور کسی تعلیمی ادارہ سے عدم وابستگی اور مطب و ملازمت کی مصروفیت مانع نہیں آئی۔ بیاض خاص کے نام سے ان کی ایک

کتاب ۱۹۸۷ء میں طبع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

سہسوان ہندوستان میں مسلم تہذیب کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اس کی بڑی روشن علمی تاریخ ہے۔ حکیم افتخار احمد وہاں کے ایک ممتاز خانوادہ کے رکن ہیں۔ ان کا خاندان علما اور اطباء کا خاندان ہے۔ اسلامیات، طب اور شعر و ادب پر اس خاندان نے تابندہ نقوش ثبت کئے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں مولانا عبدالخالق نقوی (دہلی) عربی زبان و ادب میں اور حکیم اختر عالم (بھوپال) طب میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ حکیم اختر عالم میرے مخلص دوست، اور حکیم افتخار احمد کے خسر تھے۔

اوراق پارینہ کے نام سے ذیابیطس پر یہ مجموعہ، مفید دواؤں کی تلاش کے لئے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی سے بے نیاز کرے گا۔ اور اس میں مذکور بعض دوائیں محققین کی خصوصی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ کتاب کے شروع میں عضو متعلق کی تشریح، منافع اور مرض کے قدیم و جدید نظریات اور کتاب کے آخر میں دواؤں کی فہرست اور ان کے نباتی ناموں کا اندراج بہت مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی عمر میں برکت دے اور انہیں مزید علمی کاموں کا موقع عطا فرمائے۔

۴/اپریل ۱۹۹۹ء

OO

تقدمہ مجربات تکمیلی

حکیم جلال الدین تکمیلی، تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے فارغ ہیں ان کا تعلق طبیبوں کی اس نسل سے ہے جسے اپنے فن پر اعتماد تھا اور جس نے تحصیل علم کے لئے اپنے اساتذہ کے سامنے ادب واحترام سے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ پونہ میں یونانی مطب اور معالجہ کو فروغ دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ پونہ ہندوستان کے ان شہروں میں ہے جہاں یونانی کی کوئی خاص روایت نہیں رہی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں وہاں یونانی میڈیکل کالج کے قیام کے بعد جو اساتذہ اس سے وابستہ ہوئے ان میں حکیم جلال الدین اس لحاظ سے امتیاز رکھتے ہیں کہ انہوں نے شروع سے یونانی مطب و معالجہ سے تعلق قائم رکھا اور آہستہ آہستہ بہ حیثیت طبیب نہ صرف ان کو شہرت حاصل ہوتی گئی بلکہ کالج میں یونانی طریقہ علاج کی باقاعدہ طرح بھی پڑی اور شہر کے لوگوں کو اس طریقہ علاج سے فائدہ اٹھانے کے مواقع میسر ہوئے۔

حکیم صاحب کو درس کے دوران اپنے اساتذہ یا دیگر اطباء سے جو نسخے حاصل ہوئے تھے، ان کا انہوں نے اپنے مریضوں پر تجربہ کیا اس کے علاوہ خود بھی بعض تراکیب وضع کیں اپنے تجربہ شدہ نسخوں کو مجربات تکمیلی کے نام سے انہوں نے مرتب کیا ہے۔

اردو میں نسخوں کے بہت سے مجموعے ترتیب دیئے گئے ہیں اور ہمارا طبی ذخیرہ اس قسم کی کتابوں سے بھرا ہوا ہے، اپنی ضخامت کے اعتبار سے یہ مختصر مجموعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس سے ایک کامیاب معالج کے آزمودہ نسخے سامنے آتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ نسخے جو بہت کم اجزاء پر مشتمل ہیں طلباء اور معالجین کے لئے کار آمد ثابت ہوں گے۔

۱۸ نومبر، ۱۹۹۹ء

مطبوعہ سٹی پرنٹ، دہلی، ۱۹۹۹ء

تقدمہ تاریخ طب

تاریخ کا یہ مفہوم کہ وہ صرف ولادت ووفات اور دیگر واقعات زندگی سے متعلق ہے، اور اس کے دائرے میں صرف افراد آتے ہیں، بہت ناقص اور غیر علمی ہے۔ کسی علم کی تاریخ کا اعلیٰ اور صحیح مقصد دراصل یہ ہے کہ وہ اس علم کی پوری سرگزشت بن جائے۔ اور مختلف ادوار میں اس کے تعلق سے جو کام انجام پایا ہے، وہ ایک مربوط اور منظم شکل میں سامنے آئے۔ تاریخ محض منتشر واقعات کو مرتب شکل میں پیش نہیں کرتی، ذہن کو بصیرت اور فکر کو جلا بھی بخشتی ہے۔ علم کی روانی اور اس کے مراحل و مدارج کے مطالعہ اور فکر انسانی کی رہبری کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ وہ بصیرت افزائی کا باعث ہوتی ہے اور اس کی روشنی میں تحقیق کی نئی سمتوں کا تعین ہوتا ہے۔

کائنات کی فضائے بسیط میں کرۂ ارض کی عمر دیگر کروں سے بہت کم ہے۔ پھر کرہ ارض کے وجود میں آنے کے ہزاروں برس بعد حیات انسانی کا وجود ہوا۔ نسل انسانی کی عمر کے بارے میں جو اندازے پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے اس کی عمر پانچ لاکھ سال سے لے کر پانچ کروڑ برس تک خیال کی گئی ہے۔ یہ سارا زمانہ قبل از تاریخ کہلاتا ہے۔ تاریخ کے زمانہ کا آخری سرا دس ہزار برس سے زیادہ آگے کا نہیں ہے۔ ظہور انسانی کی نسبت سے یہ مدت اگرچہ بے حد مختصر ہے، لیکن انسان کی ذہنی و فکری ترقی کا سفر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ انسانی عقل و تجربہ کی روایت اس میں پوشیدہ ہے۔ جہاں تک طب کا تعلق ہے، اس کی تاریخ نسل انسانی کے وجود میں آنے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن دس ہزار برس پہلے کی معلومات اور ان کے نتائج کی حیثیت نہ ظن و قیاس سے زیادہ ہوگی اور نہ قدر و قیمت کے لحاظ سے سود مند۔ وہ بڑے ٹھہراؤ کا زمانہ تھا، جو ہزارہا برس تک ایک حال پر قائم رہا۔ اس لیے دس ہزار برس کا یہ تاریخ کا زمانہ

اگرچہ مختصر سہی لیکن انسانی عقل وذہن کے حیرت انگیز کمالات سے بھرپور ہے۔

طب کا آغاز دنیا میں کس ملک میں پہلے ہوا۔ اس کا جواب اس لیے آسان نہیں ہے کہ تاریخ کی عمر طب کی عمر سے کہیں کم ہے۔ انسان کے عالم وجود میں آتے ہی کسی نہ کسی درجہ میں طب کی ابتدا ہو گئی تھی۔ وہ ممالک جنہوں نے تہذیبی، تمدنی اور علمی لحاظ سے پہلے ترقی کی، بلحاظ اہمیت وضرورت انہی ملکوں میں طب کا دھارا بھی پہلے پھوٹا اور انہوں نے اپنے مخصوص علم و تجربہ کے مطابق اپنی مخصوص طب تشکیل دی۔ ان ملکوں میں مصر، بابل، چین اور ہندوستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قدیم مورخین نے باختلاف آرا انہی ملکوں کے باشندوں کو طب کا موجد و مخترع قرار دیا ہے۔ یونانی طب جس نے بہت آگے چل کر ایک منظم و مرتب فن کا درجہ اختیار کیا، اس کی کڑیاں براہ راست مصر و بابل سے جڑی ہوئی ہیں۔

ان ممالک میں مصر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی پانچ ہزار برس قبل مسیح کی تاریخ سنوی تسلسل کے ساتھ محفوظ ہے۔ مصری طب کے بارے میں ہمارے اب تک کے ذرائع معلومات، مدفون شہروں اور معبدوں سے دستیاب شدہ کتبات، عمارتوں، نقاشیوں اور لوحوں کی دریافت، قدیم آثار کی کھدائی اور یونانی و رومی مورخوں کے بیانات تھے۔ ان سے طب کے بارے میں کوئی واضح تصویر سامنے نہیں آتی تھی۔ مصری علوم کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح معلومات گزشتہ صدی میں اس وقت حاصل ہوئیں جب فرانسیسی محقق چیمپولین نے ۱۸۳۲ء میں ان قدیم مصری تحریروں کے چہرہ سے نقاب الٹی جو اوراق بردی (پاپرس) کے نام سے موسوم ہیں۔ ان اوراق بردی کے ذریعہ مصری علوم کے مطالعہ کا براہ راست موقع ملا ہے۔

قدیم عراق یعنی بابل و نینوا میں سمیری، عکادی، آشوری، کلدانی سلطنتیں قائم تھیں۔ ان کی تہذیبی و طبی اقدار کا مطالعہ بعید ترین انسانی معلومات کی بہترین کوششوں کا اظہار ہے۔ اس واضح علم کے باوجود کہ دجلہ و فرات کی وادی میں ابھرنے والی تہذیب اور وہاں رائج طب کو قدیم ترین درجہ حاصل ہے، درمیانی تاریخ کی کڑیاں مسلسل قائم نہ

رہنے کی وجہ سے اس کی طب کے بارے میں مصر سے کہیں کم واقفیت ہے۔

یونان کی تاریخ، اس کی تہذیب و تمدن، علم و ادب اور طب و سائنس کا کوئی سراغ ٹرائے کی جنگ (۱۲۰۰ق م) سے پہلے نہیں ملتا۔ اس سے پہلے ان کی حیثیت ایک غیر متمدن اور بدوی قوم سے زیادہ نہیں تھی۔ اسقلبیوس جو یونانی طب کی تاریخ کا پہلا نام ہے، معرکہ ٹرائے میں اس کے دو بیٹوں کی شرکت کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح اس کے دو بیٹے ماخون اور بدرلیوس اور دو بیٹیاں ہائیجیا (صحت کی دیوی) اور پینیشیا (بیماری کو ٹالنے والی دیوی) بارہویں صدی قبل مسیح کے نمائندے ہیں۔ ہومر جس کا زمانہ تقریباً نویں صدی قبل مسیح کا ہے، اپنی نظموں کے مضامین کی وجہ سے طب کی تاریخ میں خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اس نے یونانی طب کے متعلق پہلی واقفیت بہم پہنچائی۔ اس کی نظموں سے پیشہ ور طبیبوں کی طب اور سرجری میں پہلے سے ترقی یافتہ پریکٹس کا ثبوت ملتا ہے۔ جالینوس نے ہومر کے زمانہ میں طب کی پریکٹس کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی، جو اب ناپید ہے۔ ہومر نے ہمیں جو معلومات عطا کی ہیں، ان کا تعلق محض نویں صدی قبل مسیح سے نہیں ہے، وہ ان معلومات کو بھی ظاہر کرتی ہیں جو گزشتہ صدیوں میں حاصل تھیں۔ یونانی طب جس کی باقاعدہ تاریخ بارہویں صدی اسقلبیوس کے زمانے سے شروع ہوئی، نویں صدی تک پہنچتے پہنچتے علاج کی ایک واضح شکل اختیار کر چکی تھی۔ اور دسویں اور گیارہویں صدی قبل مسیح میں طب اور جراحت کو فنی حیثیت حاصل تھی۔ مگر اس وقت تک دوسرے علوم کی طرح یہ محض علم سینہ تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے یونان میں تحریر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اہم ترین واقعات بھی زبانی یاد رکھے جاتے تھے۔ اور سینہ بہ سینہ منتقل کئے جاتے تھے۔ وقائع کو محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ شعر گوئی ہے۔ یونان کی ابتدائی تاریخ کا ایوان بھی اس پر تعمیر کیا گیا ہے۔ ہومر کی نظموں کے علاوہ دوسرے شعراء مثلاً آسیوں (غالباً ساتویں صدی قبل مسیح) یومیلوس (آٹھویں صدی ق م) ہیسائڈ (آٹھویں صدی ق م) کی شاعری نے زبانی روایات کے ساتھ ابتدائی مورخین کے لیے مواد فراہم کیا ہے۔

جہاں تک تاریخ نگاری کا تعلق ہے، چھٹی صدی قبل مسیح سے پیشتر یونان میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ سب سے قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس ہے جس کا تعلق پانچویں صدی قبل مسیح سے ہے۔

بقراط (۴۶۰ق م) کے طبی نظریات تک پہنچنے کے لیے یونان نے طب و حکمت کا جو چند صدیوں کا رشتہ طے کیا ہے، دوسری قوموں کو اس کے طے کرنے میں ہزاروں سال کا وقت لگا ہے۔ لیکن یونانیوں کی یہ طبی معلومات کسی اچانک ظہور کا نتیجہ نہیں تھیں۔ اس کی پشت پر صدیوں کا عمل اور قدیم اقوام کے علم و تجربہ کی روشنی تھی۔ یونانیوں نے جو طبی معلومات فراہم کیں، انہیں منظم طور پر پیش کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ بقراط نے اپنے عہد کے طبی افکار ترتیب دے کر علاجی نظام کو عطائیت سے اوپر اٹھایا اور اسے ایک منضبط فن کا درجہ بخشا۔ بقراط کے بعد کے محققین کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ یہاں جالینوس (۲۰۱۔۱۲۹ء) کی فنی عظمت کا اظہار ضروری ہے۔ اس کی اعلیٰ تحقیقی کاوشوں کی بدولت اس نظام فن کو باقاعدہ علمی حیثیت حاصل ہوئی۔

عربوں نے یونانیوں کے طبی نظریات کو اساس قرار دے کر دوسری اقوام و ممالک کی طبوں سے استفادہ کیا اور تنظیمی طور پر تحقیق و اجتہاد کے ذریعہ یونانی طب پر لازوال نقوش ثبت کیے۔ طب کے ہر موضوع پر مہتم بالشان ذخیرہ ان کی یادگار ہے۔ انہوں نے تحقیق و تجربہ کی روایت کو اس طرح آگے بڑھایا اور طب کے مختلف مضامین میں یونانی ذخیرہ پر اس قدر اضافہ کیا کہ اس کی پوری ہیئت بدل کر رکھ دی۔ کسی بھی موضوع کی یونانی مصنفین کی کتابوں کے موازنہ سے عرب اطباء کے اضافات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

طب کی یونانی اور عربی عہد کی تاریخ کا بہت تفصیل سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ عربی زبان کے علاوہ مغربی زبانوں میں اس پر جامع اور مستند کتابیں دستیاب ہیں۔ عرب اطباء کی تصانیف کے براہ راست مطالعہ اور ان کے امتیازات کی روشنی میں تاریخ کی ترتیب کے علاوہ عرب مورخین کی کتابوں سے بڑا قیمتی مواد حاصل ہوا ہے۔ ابن ندیم، ابن

بجاجل، ابن قفطی، قاضی صاعد اندلسی، ابن ابی اصیبعہ، حاجی خلیفہ وغیرہ کی کوششیں اس سلسلے میں بے حد وقیع ہیں۔

طب کا ہندوستانی عہد تقریباً آٹھ سو برس پر پھیلا ہوا ہے۔ عہد سلطنت اور عہد مغلیہ کے علاوہ دوسری حکومتوں اور ریاستوں میں علم وفن کی روایت جس طرح آگے بڑھی ہے، طبی اقدار کو جس طرح یہاں فروغ ملا ہے، مختلف موضوعات پہ جو عالمانہ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، قدیم ذخیرہ علم پر جو اضافات واکتشافات کئے گئے ہیں، اس کے غائر مطالعہ پر ابھی ہماری کوششیں صرف نہیں ہوئی ہیں۔ یہ کام برصغیر ہی کے طبی ماہرین کو انجام دینا ہے۔ تاریخ طب پر اردو میں ادھر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض میں یہاں کے طبی مکاتب فکر کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے ۵۸۔ لیکن غیر منقسم ہندوستان جسے ایک برصغیر کی حیثیت حاصل ہے، اس کے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں اور منطقوں کو سمیٹنا ایک مصنف کے لیے آسان نہیں ہے۔ یہ بہت پھیلا ہوا موضوع ہے۔ اور اس پر ابھی تک کوئی مستقل کام نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے واسطے ثانوی ذرائع اور عام تاریخ و تذکرہ کی کتابوں سے مواد فراہم کرنے کے علاوہ طبی مصنفین کی اصل کتابوں کا مطالعہ درکار ہے۔ ہندوستانی مصنفین کی تصنیفات کے براہ راست مطالعہ کے بغیر اس کو صحیح معنوں میں پورا نہیں کیا جاسکتا۔ طب کی بیشتر ہندوستانی تصانیف مخطوطات کی شکل میں ملک کے کونہ کونہ میں واقع کتب خانوں میں بکھری ہوئی ہیں اور کمتر زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔ اسکے لیے پہلے مخطوطات کی تلاش اور دستیابی ضروری ہے۔ ۱۹۸۴ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ کے طب مخطوطات سیمینار کے ذریعہ یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو سکا ہے۔ اس سیمینار کی روئداد "طب اسلامی برصغیر میں" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ اس سے کافی تعداد میں مخطوطات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تاریخی تحقیق کے لیے اصل ماخذ تک رسائی اور ان کا ناقدانہ جائزہ اولیت کا متقاضی ہے۔ اس کے بعد ہی یہاں کی شخصیتوں اور کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ اور ان کے امتیازات واضافات اور فنی مرتبہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

اصل تصانیف کو پڑھے بغیر محض دوسرے مصنفین کے بیانات یا ثانوی ذرائع کی روشنی میں انجام دیا گیا کام، اصول تحقیق اور جدید علمی معیار کے مطابق نہیں سمجھا جائے گا۔ مغلیہ عہد کے اطبا کی فہرست سازی کا کام دوسرے ادوار کی نسبت سے ضرور زیادہ ہوا ہے لیکن اس عہد کے مصنفین کا بھی ابھی تنقیدی مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔

برصغیر کے طبی کالجوں کے نصاب میں اگرچہ تاریخ کا مضمون شامل ہے۔ مگر جس غیر اہم انداز میں اس کی تدریس کا سلسلہ جاری ہے، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ کسی طبی کالج میں اس کی کوئی باقاعدہ آسامی نہیں ہے۔ چند برس پہلے تک نصابی نقطہ نظر سے کوئی کتاب بھی دستیاب نہیں تھی۔ ادھر تین چار نصابی کتابیں ضرور ترتیب پائی ہیں۔ لیکن تدریس کے مروجہ طریقہ کی وجہ سے تاریخ کا وہ شعور اور فن کا وہ عرفان نہیں پیدا ہوتا، جو طب کے ایک طالب علم کے لیے اس وجہ سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ یہاں قدیم شخصیتیں محض تاریخ کی زینت کے بطور نہیں ہیں۔ ان کے نظریات اور تصانیف کو آج بھی حوالہ کی حیثیت حاصل ہے اور ان سے فنی رہنمائی کا کام لیا جاتا ہے۔ تاریخی معلومات کے فقدان کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر اساتذہ متعلقہ موضوع کی مستند اور حوالہ جاتی کتب کے نام تک سے ناواقف نظر آتے ہیں۔ طبی کالجوں میں طب کی عالمی تاریخ کے ساتھ طب یونانی کی تاریخ بالخصوص ہندوستان کے امتیازی کاموں کا تعارف، ممتاز مصنفین کی کتابوں پر نقد و نظر، ان کی فنی منزلت، اضافات واجتہادات، عصری علوم سے استفادہ اور اس کا اثر، دوسری طبوں کے جائزہ اور تقابلی مطالعے کی روشنی میں طب یونانی کی افادیت اور اثر آفرینی کو خاص طور پر ذہن نشیں کرانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ طب یونانی کی اہمیت و وقعت کا انہیں پورے طور پر احساس ہوگا اور نہ اطباء کی عظمت کا نقش ان کے دلوں پر قائم ہوگا۔ تاریخ ہی ایک ایسا مضمون ہے جس کے ذریعہ حقدمین کی مساعی علمیہ اور کارناموں سے واقفیت ہوتی ہے اور فن کی ترقی میں ان کا قرار واقعی حصہ نظر آتا ہے۔ مغربی مورخین کی تصانیف سے انہی کی برتری اور قدآوری کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔

"تاریخ طب" کے عنوان سے پیش نظر کتاب موجودہ عہد کے ایک بڑے فاضل حکیم عبدالوہاب ظہوری کی فراہم کردہ معلومات کی اساس پر ہے۔ حکیم صاحب کا شمار ہندوستان میں تاریخ طب کی گرامی منزلت شخصیتوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تاریخی معلومات نہایت وسیع ہیں اور وہ اس موضوع پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب جو بہت ضخیم اور بہت تفصیلات پر مشتمل تھی، جامعہ ہمدرد کے شعبہ تاریخ طب و سائنس میں محفوظ تھی۔ اس شعبہ کے ایک باصلاحیت طبیب حکیم عبدالباری نے کچھ حذف واضافہ کے ساتھ اس کی تلخیص کے فرائض انجام دیئے ہیں اور اسے مواد کے طور پر استعمال کر کے نصاف کی جامع کتاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کوشش میں اس لئے بھی کامیاب ہیں کہ اس کام کی ادائیگی سے قبل انہوں نے تاریخ کے مطالعہ پر اپنا کافی وقت صرف کیا ہے۔

کتاب کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ قدیم مصری، بابلی، چینی، ہندی، ایرانی اور یونانی طب کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں یونانی عہد پر خاص کر عہد بقراط پر جسے بجا طور سے یونان کا عہد زریں قرار دیا گیا ہے، تفصیل سے لکھنے کے علاوہ ماقبل بقراط اور مابعد بقراط یونانی طب کی عمومی صورتحال اور مدرسہ اسکندریہ کی طبی خدمات کا جائزہ شامل ہے۔ رومۃ الکبریٰ کی طب، جالینوس کے پیش رو اطباء اور جالینوس کی فنی عظمت اور اس کے مجتہدانہ کاموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ جالینوس کے بعد کے حالات، بازنطینی طب اور کلیسا کی مخالفتوں پر اس حصہ کو ختم کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ عہد وسطیٰ کے بیان میں ہے۔ اس کے پہلے باب میں ظہور اسلام سے پہلے علمی و طبی مراکز جندیشاپور، حران اور اسکندریہ کے ذکر کے بعد دوسرے باب میں عہد نبوی پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث میں مذکور حکیمانہ نظریات اور طبی مسائل اس کے دائرہ میں آگئے ہیں۔ تیسرا باب عہد اموی کے حالات میں ہے۔ چوتھے باب میں شرح وبسط سے عہد عباسی کی طبی ترقیات بیان کی گئی ہیں۔ اس باب میں بغداد میں مختلف ممالک اور مختلف اقوام کے ماہرین کا اجتماع، قدیم

طبی کتابوں کے تراجم اور مترجمین کے حالات سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ باب جس تفصیل کا متقاضی تھا اسی تفصیل سے اس کا حق ادا کیا گیا ہے۔ پانچواں باب عربی عہد کے طبع زاد مصنفین کے علمی کاموں پر مشتمل ہے۔ اس میں یعقوب بن اسحاق کندی، علی بن ربن طبری، محمد بن زکریا رازی اور احمد بن طبری کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ چھٹا باب آل بویہ کے دور میں طب کے عروج سے متعلق ہے۔ اس میں عضد الدولہ کے درباری اطبا اور اس کے بعد کے فضلا کے کاموں کے علاوہ ابو سہل مسیحی اور ابن سینا کی تصنیفات اور مشرق و مغرب میں قانون کی اثر انداز حیثیت، منزلت اور تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بڑا جامع باب ہے۔ ساتواں باب سلجوقی حکومت کی تشکیل اور اس عہد کی طبی ترقی سے متعلق ہے۔ اس میں ابن ابی صادق، اسماعیل جرجانی، ابوالفرج ابن طیب، ابن بطلان، ابن جزلہ جیسے عالمی شہرت کے طبیبوں کا تذکرہ ہے۔ خلافت عباسیہ کے خاتمہ پر اس کا اختتام ہوا ہے۔

کتاب کا حصہ دوم زوال بغداد کے بعد ایران کے تاتاری، تیموری اور صفوی عہد سے متعلق تین ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ادوار میں قطب الدین مصری، نجیب الدین سمرقندی، قطب الدین شیرازی، رشید الدین فضل اللہ، بہاء الدولہ، زین الدین عطار، مظفر حسین شفائی، عماد الدین محمود شیرازی وغیرہ پایہ کے طبیب شامل ہیں۔

تیسرا حصہ اندلس کے عہد امیہ سے عہد نصیریہ تک کے بیان میں ہے۔ اس کا پہلا باب شمالی افریقہ کے اطباء مثلاً اسحٰق بن عمران، اسحٰق بن سلیمان، ابن الجزار کے لئے مخصوص ہے۔ دوسرے باب میں اندلس میں عقلی و ثقافتی زندگی کی تدریجی ترقی، حکمرانوں کی علوم و فنون سے دلچسپی اور وہاں کے مدارس اور کتب خانوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ تیسرا باب اندلس میں طب اور اس سے متعلق علوم کے ارتقا کیلئے وقف ہے۔ اس میں نویں سے بارہویں صدی تک کے اطباء کی خدمات جلیلہ کا ذکر ہے۔ یہ اپنے دامن میں ابن جلجل، ابوالقاسم زہراوی، ابن حزم، ابن وافد، الغافقی، امیہ بن ابو الصلت، ابن زہر اور ابن رشد جیسے یگانہ عصر طبیبوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

کتاب کا چوتھا حصہ بلاد شام اور مصر کی طبی سرگرمیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے پہلے باب میں آل طولونیہ، دولت فاطمیہ، عہد ایوبی، عہد مملوک کا حال ہے۔ دوسرے باب میں مصری و شامی طبیبوں ابن بطلان، ابن رضوان، ابن مطران، عین زربی، ابن میمون، عبداللطیف بغدادی کی فنی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب تیرہویں صدی کا زریں دور ہے۔ اس باب کی نامور شخصیتیں ابن بیطار، ابن ابی اصیبعہ، ابن نفیس، ابن القف ہیں۔

کتاب کے آخری پانچویں حصہ میں ہندوستان میں طب کے ارتقاء پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اسمیں چار باب ہیں۔ پہلے باب میں عہد سلطنت پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے جس میں خاندان تغلق اور گجرات کی طبی تاریخ خصوصیت سے شہاب بن عبدالکریم کا ذکر ہے۔ دوسرا باب لودھی سلطنت میں معدن الشفا سکندر شاہی کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ پروفیسر محمد زبیر صدیقی نے اصل کتاب کے مطالب کی روشنی میں بہت پہلے اس کا تعارف کرایا تھا۔ تیسرا باب جو نسبتاً زیادہ طویل ہے مغلیہ عہد میں طب کی ترقی اور اہم شخصیتوں کے حالات میں ہے۔ چوتھے باب میں برطانوی ہند کی طبی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی، دربار اودھ اور ہندوستان کے مشہور طبی خانوادوں کا ذکر ہے۔ سلاطین آصفیہ کے عہد کی طبی ترقیات پر کتاب کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

ہندوستان کا یہ عہد جس تفصیل کا متقاضی تھا اس سے کتاب میں عہدہ برآ نہیں ہوا جاسکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہندوستانی اطباء کے کاموں کا تنقیدی مطالعہ، ان کی تصانیف کی روشنی میں مرتبہ کا تعین، عربی و ایرانی مصنفین کے مقابلہ میں ان کے امتیازات، مقامی اثرات کی آمیزش، مختلف طبی مضامین بالخصوص مفردات، مرکبات، دواسازی، تکلیس، فن علاج، مطب و نسخہ نویسی میں ان کے اضافات پھر عصری علوم کی روشنی میں تشریح، منافع الاعضاء، حفظان صحت، ماہیت الامراض وغیرہ میں ان کے اصلاحی اقدامات پر تفصیلی تبصرہ ضروری تھا۔

جامعہ ہمدرد کا شعبہ تاریخ طب و سائنس اپنی نوعیت کا پہلا شعبہ ہے

جو ہندوستان میں قائم ہوا۔ اسکے بانی حکیم عبدالحمید قدر و ستائش کے مستحق ہیں۔ وہ اس شعبہ کو غالباً پانچویں دہائی کے شروع میں قائم کر چکے تھے اور اس کے واسطے مطبوعات و مخطوطات کا قیمتی ذخیرہ انہوں نے فراہم کیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں تغلق آباد میں ادارہ تاریخ و تحقیق طب کے قیام کے بعد اس شعبہ کو مزید ترقی حاصل ہوئی۔ اور اس سے متعدد قابل قدر کام انجام پائے۔ ۱۹۸۴ء میں پروفیسر رضا اللہ انصاری (شعبہ طبعیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) کی خدمات اس کے لئے حاصل کی گئیں۔ انہوں نے اسے ایک نئی شکل دے کر "شعبہ تاریخ طب و سائنس" کے نام سے تحقیقی کاموں کا مرکز بنایا۔ ان کی زیر نگرانی شعبہ سے جن اہم کاموں کی اشاعت عمل میں آئی ان میں وسط ایشیا اور ہندوستان کے طبی روابط، اٹھارہویں انیسویں صدی کے ہندوستان میں جدید مغربی علم ہیئت کا تعارف اور جرنل اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسن اینڈ سائنس قابل ذکر ہیں۔

۱۹۸۹ میں حکیم عبدالحمید کی گراں قدر مساعی سے ادارہ تاریخ و تحقیق طب اور ہمدرد کے دوسرے تعلیمی شعبوں نے جامعہ ہمدرد کی شکل اختیار کی۔ اور آج اس شعبہ تاریخ طب و سائنس کا شمار جامعہ کے ایک ایسے مرکز امتیاز کے بطور ہے جس سے اس کی پہچان قائم ہوتی ہے۔ اور جو جامعات ہند میں اس کیلئے انفرادیت کا باعث ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس شعبہ کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ طب کے مطالعہ کو فروغ ملے گا اور طبی تاریخ سے دلچسپی اور ذوق پیدا کرنے میں یہ معاون ہوگی۔

۳۱ر جولائی ۱۹۹۱

OO

تقدمہ تاریخ طب واخلاقیات

تاریخی جائزہ اور قدیم سرمایہ کی قدر و منزلت کے تعین کے بغیر کسی بھی علم کا مطالعہ آسان نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن جن علوم کی کڑیاں ماضی سے مضبوط طور پر مربوط ہیں اور جن کے ہاں قدیم مصنفین اور ان کے نظریات آج بھی زندہ ہیں اور روشنی ورہنمائی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں مثلاً ادبیات اور سماجی علوم ان میں قدیم ورثہ سے صرف نظر اور زیادہ مشکل ہے۔

طب یونانی بھی ان علوم میں ہے جس کا رشتہ ماضی سے اس طرح استوار ہے کہ اگر اس کو منقطع کر دیا جائے تو اس کی عمارت متزلزل اور اس کے مطالعہ و تحقیق کی راہیں بے نور نظر آئیں گی۔ بقراط و جالینوس، محمد بن زکریا رازی اور ابن سینا کے نظریات اور ان کی کتابیں محض الماری کی زینت کے بطور نہیں ہیں اور ان کا مطالعہ خالص تاریخی اہمیت ہی کا حامل نہیں ہے، ان کی عملی اور افادی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔ اور طبی تحقیق و مطالعہ میں انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

طب یونانی کی تاریخ کا مطالعہ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اس کے ذریعہ اس مضمون کی مختلف ادوار میں ترقی اور پیش رو مصنفین کی خدمات اور فنی کارناموں کا تعارف سامنے آتا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی زیادہ دلچسپ اور وقیع ہے کہ دوسری طبوں مثلاً آیورویدک یا چینی طب جن کا دائرہ سمٹا ہوا اور متعلقہ ملک کی حد تک محدود ہے۔ جب کہ مختلف اقوام و ممالک سے تعلق رکھنے کی وجہ سے طب یونانی کی وسعتیں اور اس کی تاریخ کا پھیلاؤ کہیں زیادہ ہے۔ اس کا سرا جہاں ایک طرف قدیم مصری و بابلی طبوں سے جڑا ہوا ہے، وہاں اس کا قافلہ یونان سے چل کر روم، عرب اور ایران ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا ہے۔ اس کی

مطبوعہ ہوریژن پرنٹرس، بنگلور، ۱۹۸۳ء

منزلوں میں اندلس، وسط ایشیا کے ممالک، ترکی، روس، افغانستان اسی طرح افریقی ممالک مصر، مراکش، الجزائر وغیرہ شامل رہے ہیں۔ ان ممالک میں مختلف زبانوں میں جو کام انجام پائے اور جو عظیم طبی شخصیتیں پیدا ہوئیں، اسی طرح ان کی زبانوں میں تصنیف و تالیف کا جو وسیع سلسلہ رہا، ان سب کے مطالعہ نے اس فن کی تاریخ کو بہت متنوع اور پر کشش بنایا ہے۔ اسکے ذریعہ نہ صرف طبی تاریخ بلکہ متعلقہ ملکوں کی علمی و تمدنی زندگی پر عمومی طور سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور مصری، یونانی، رومی، سریانی، بربری، فارسی اور اردو زبان کے نقطہ نظر سے بھی اس کے مطالعہ میں دلچسپی کے بہت سے سامان ہیں۔

دوسری طبوں کے مقابلہ میں طب یونانی کا ایک اہم امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی تاریخ کی کڑیاں نہ گم ہیں اور نہ درمیان سے غائب ہیں۔ ایک مرتب، مربوط اور مسلسل تاریخ جس سے اس کی عہد بعہد ترقیات کا پورا خاکہ سامنے آتا ہے اور مستقبل کی تعمیر میں مدد اور رہنمائی ملتی ہے۔

طب کے یونانی، عربی اور ایرانی ادوار پر کافی کام کیا گیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں آٹھ سو برس کی مدت میں جو طبی کارنامے انجام پائے ہیں، اور اطبائے ہند نے طبی روایات کو جس شاندار طریقہ پر آگے بڑھایا ہے، اسے ابھی تک مرتب نہیں کیا جاسکا ہے۔ ہندوستان کی طبی تاریخ کے کتنے ہی گوشے عام نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ طب یونانی کے ہندی عہد پر کام اس لئے بھی آسان نہیں ہے کہ اس کا دائرہ محض مرکزی حکومت تک محدود نہیں ہے۔ مغل عہد سے قبل یا عہد مغلیہ کی طبی خدمات کے علاوہ ہندوستان کی ریاستوں میں جو بیش قدر طبی کام انجام پائے ہیں، وہ خود ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعہ کے بغیر ملک کی طبی تاریخ ہر طرح ادھوری اور نامکمل ہے۔

ہندوستان کی متعدد ریاستوں میں ان کے علم پرور اور بیدار مغز فرمانرواؤں کی زیر پرستی طب کی بڑی اعلیٰ خدمات انجام پائی ہیں۔ تصنیف و تالیف اور طبی معالجہ کے فروغ اور اطباء کی حوصلہ افزائی میں یہ ریاستیں پیش پیش رہی ہیں۔ اودھ، بنگال، دکن اور بعض دوسری ریاستوں کی طرح میسور کے حکمرانوں نے بھی دوسرے علوم کے ساتھ طب کی

ترقی میں زبردست حصہ ادا کیا ہے۔

سلطان ٹیپو جس نے ۱۷۹۹ء میں انگریزوں سے شکست کھائی۔ جہاں شمشیر و سنان اور میدان کارزار کا شہ سوار تھا، وہاں علم کا اعلیٰ مذاق رکھنے والا حکمران بھی تھا۔ جن علوم سے اسے دلچسپی تھی ان میں طب بطور خاص شامل ہے۔ اس کی طبی واقفیت اور استعداد کا یہ حال تھا کہ مختلف مواقع پر اس نے خود بطور معالج نسخے تجویز کیے ہیں۔ سرنگا پٹنم میں ایک نباتی باغ بھی اس کی یادگار تھا جس میں مختلف جگہوں سے فراہم کر کے پودوں کی کاشت کی گئی تھی۔ سلطان نے میسور میں قیمتی و نادر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ چارلس اسٹوارٹ نے اس کتب خانہ کی جو فہرست مرتب کی ہے وہ کیمبرج یونیورسٹی پریس سے ۱۸۰۹ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس کے مطابق اس کتب خانہ میں دوسرے علوم کے علاوہ تباہی کے بعد بچی کچھی ۶۸ نایاب طبی کتابیں محفوظ تھیں۔ ان میں عالمگیری عہد کے طبیب محمد رضا کی ریاض عالمگیری کے علاوہ ایک کتاب کرناٹک میں استعمال کی جانے والی ادویہ سے متعلق بھی تھی اس کا سال تصنیف ۱۷۵۱ء ہے۔ اور اسے نواب محمد علی خاں فرمانروائے آرکاٹ کے طبیب حکیم سکندر بن اسماعیل نے مرتب کیا ہے یہ طبیب قسطنطنیہ کا رہنے والا تھا کتاب کا انتساب ولی نعمت نواب محمد علی خان کے نام ہے۔ اس سے مراد غالباً قرابادین سکندری ہے۔ اسی مصنف کی دو اور کتابیں کتاب الامراض جو ۱۷۴۷ء کی لکھی ہوئی ہے اور دوسری جو اسی کتاب کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے، نواب محمد علی خاں کے نام معنون ہیں اور مدراس کی طبی تاریخ کے مطالعہ میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

سلطان ٹیپو کی زیر سرپرستی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں طبی کتابوں میں محمد نصیر افشار ترک کی علم الادویہ پر ایک کتاب ہے، جو سلطان کے نام منسوب ہے۔ اس میں حروف تہجی کے مطابق دواؤں کے خواص و منافع بیان کیے گئے ہیں۔ محمد نصیر نے مفردات طب کے علاوہ سلطان کے حکم سے جو دیگر کتابیں تالیف کیں ان میں بحرالمنافع اور تحفہ محمدیہ قابل ذکر ہیں۔

سلطان کے حسب الحکم دوسری زبانوں سے نقل و ترجمہ کا کام بھی انجام دیا گیا

تھا۔ چنانچہ مختلف علوم وفنون کی ۴۵ کتابیں انگریزی اور فرانسیسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ ان تراجم میں طب جدید کی متعدد کتابوں کے ترجمے شامل ہیں۔ ہندوستان میں کیے گئے مغربی طب کے یہ پہلے ترجمے تھے جو میسور میں انگریزی سے فارسی میں ہوئے۔ ان میں "قانون در علم طب" لندن ڈسپنسری کا ترجمہ، کتاب فرنگ، ڈاکٹر کاکرین کی کتاب "آنتوں کے بل" کا ترجمہ، اسی طرح طبی و برقی تجارب پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ۔ علاوہ ازیں "نباتات اور تاریخ طبیعی" پر بھی ایک کتاب تھی، جس میں پودوں کے خاکے اور تصاویر پیش کی گئی ہیں۔

ریاست کرناٹک کی طبی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں جہاں حال ہی میں بنگلور میں ایک سرکاری طبی کالج کا قیام عمل میں آیا ہے اور بنگلور میں یونانی طب کی تعلیم و تحقیق کا ایک اعلیٰ مرکزی ادارہ (نیشنل انسٹی ٹیوٹ) قائم ہونے جارہا ہے۔ وہاں اس ریاست کے ایک نوجوان اور باصلاحیت طبیب عزیزی سید شہاب الحق نے تصنیف و تالیف کے سلسلہ کا آغاز کرتے ہوئے تاریخ طب پر یہ کتاب مرتب کی ہے۔ میسور میں ۱۵۲۹ء میں مہاراجہ کے زمانہ میں ایک طبیہ کالج قائم ہوا تھا، جو اگرچہ زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکا۔ لیکن اس زمانہ میں بھی تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی تھی۔ سید شہاب الحق طبیہ کالج علی گڑھ کے طالب علم رہے ہیں۔ اپنے تعلیمی انہماک اور صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا شمار اس زمانہ کے ممتاز طلبہ میں تھا۔ یہ کتاب جو انہوں نے محنت اور سلیقہ سے مرتب کی ہے، ان کی علمی و ذہنی لیاقتوں کی آئینہ دار ہے۔ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے مجوزہ نصاب کے مطابق تاریخ طب پر ایک جامع کتاب کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اس کامیاب تلافی کے لئے وہ ہر طرح مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ طلبہ کی درسی ضرورت پوری ہوگی اور وہ دلچسپی کے ساتھ اس موضوع کا مطالعہ کر سکیں گے۔

۷ر جولائی ۱۹۸۳ء

OO

تقدمہ بیت الحکمت کی طبی خدمات

اسلامی دنیا میں علوم کی منتقلی کا آغاز ابتدائی اموی عہد سے ہو گیا تھا اور رومی، فارسی، قبطی اور دوسرے زبانوں سے عربی میں کتابیں ترجمہ کی گئی تھیں۔ اموی حکومت اندلس سے سمرقند تک پھیلی ہوئی تھی۔ دمشق منارۂ نور تھا۔ جس کی روشنی عالم کو منور کر رہی تھی۔ وہ عربی ثقافت و علم کا ایک ایسا مرکز تھا، جس کی نظیر اس زمانہ کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عہد اسلامی سے قبل شام میں متعدد مدارس قائم تھے جن میں زیادہ تر بین النہرین اور ان کے آس پاس کے علاقوں میں تھے۔ ان کے اہم مراکز میں رہا[۵۹] اور ان کے جنوب میں حران واقع تھا۔ اموی عہد میں یعقوب رہاوی مشہور شخصیت گزری ہے۔ یہ رہا کا اسقف تھا۔ ان سریانی شامی اہل علم نے یونانی علوم کی عربی میں منتقلی کا کام انجام دیا۔ بعض یونانی کتابیں جن کی اصل ناپید تھی، سریانی زبان میں محفوظ تھیں۔ سریانی کے ذریعہ عربی میں منتقلی ہوئیں اور عربوں نے ابتدا میں انہی پر اعتماد کیا۔ شام میں یونانی علوم کی منتقلی میں اولیت کا سہرا مشرقی نسطوریوں کے سر ہے، جنہیں غسانی بادشاہ نے نکال دیا تھا اور جنہوں نے شام میں پناہ لی تھی۔

مسلمانوں میں بعض لوگوں کے خیال کے مطابق خالد بن یزید (وفات ۸۵ھ/۷۰۴ء) کے ہاتھوں جسے "حکیم آل مروان" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، ترجمہ کا آغاز ہوا۔ اس کی مساعی سے جو کتابیں منتقل ہوئیں ان میں طب، کیمیا، نجوم، حرب اور ادب کی کتابیں تھیں۔ ابن ندیم اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ خالد پہلا شخص ہے جس کے لئے یونانی اور قبطی زبانوں سے عربی میں کتابیں ترجمہ کی

مطبوعہ محبوب پریس، دیوبند ۱۹۸۹

گئیں۔ خالد کو مدرسہ اسکندریہ کے فاضل استاد مریانوس کی شاگردی کا موقع ملا۔ اسیفانوس (فریانوس) اور اصطفانوس نے بھی اس کے لئے کتابیں ترجمہ کیں۔ خود خالد کی ترجمہ کردہ و تالیف کردہ کتاب الحرارۃ، کتاب الصحیفۃ الکبیر، کتاب الصحیفۃ الصغیر، کتاب وصیۃ الی ابنہ فی الصنعۃ کے نام ابن ندیم کے ہاں ملتے ہیں۔ ایک دیوان نجوم بھی اس کے نام سے منسوب ہے۔

امیر معاویہ (۵۹۔۴۱ھ/ ۶۷۹۔۶۶۱ء) کے اطباء میں ماسرجویہ بصری بڑے مرتبہ کا طبیب تھا۔ اسلامی عہد میں دراصل اس کو پہلے مترجم کا اعزاز حاصل ہے۔ مروان بن حکم کے زمانہ (۶۵۔۶۴ھ/ ۴۔۶۸۳ء) میں اس نے اہرن القس کی کناش کا سریانی سے عربی ترجمہ کیا تھا۔ ماسرجویہ کی دوسری کتابوں میں کتاب الاطعمہ و منافعہا و مضارہا، کتاب قوی العقاقیر اور کتاب العین ہیں۔ عمرو بن عبدالعزیز کو اپنے ایام خلافت میں جب یہ کتاب خزانہ خلافت میں دستیاب ہوئی تو اس یقین کے بعد کہ اسکی اشاعت مسلمانوں کے لئے مفید ہے، انہوں نے اسے عام کرنے کی اجازت دی۔

عبدالملک بن مروان (۸۶۔۶۵ھ/ ۷۰۵۔۶۸۳ء) کے زمانہ میں دواوین کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ مصر کے دواوین قبطی زبان، شام کے دواوین رومی زبان اور عراق کے دواوین فارسی زبان میں تھے، جو عربی میں منتقل کئے گئے۔ ان مترجمین میں صالح بن عبدالرحمٰن مولی بنو تمیم، ابو ثابت سلیمان بن سعد، سرجون اور ہشام کے کاتب جبلہ بن سالم اہم نام ہیں۔

خلافت بنوامیہ کے ابتدائی عہد کا ایک مشہور طبیب تیاذوق (وفات ۹۰ھ/ ۷۰۸ء) ہے۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں یہ حجاج بن یوسف ثقفی (وفات ۸۵ھ/ ۷۰۴ء) کا طبیب تھا۔ اس کی کتابوں میں کناش کبیر، ابدال الادویہ اور تفسیر اسماء الادویہ ہیں۔

یزید بن عبدالملک (۱۰۵۔۱۰۱ھ/ ۷۲۳۔۷۱۹ء) کے درباری طبیب احمد بن ابراہیم نے نہ صرف بقراط کی کتابوں کا ایک انتخاب "اصول الطب" کے نام سے

مرتب کیا، بلکہ نباتات کی تحقیق میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔

ہشام بن عبدالملک (۱۰۵۔۱۲۵ھ / ۷۲۳۔۷۴۲ء) کے کاتب ابوالعلا جبلہ بن سالم نے "رسائل ارسطاطالیس الی اسکندر" اور چند دیگر رسائل کا عربی میں ترجمہ کیا۔

یہاں امام جعفر صادق اور جابر بن حیان کا تذکرہ ضروری ہے۔ امام جعفر صادق (پیدائش ۸۳ھ / ۷۰۲ء) کی وفات اگرچہ عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء میں ہوئی۔ لیکن ان کی ۶۵ سالہ زندگی کے ۴۹ سال اموی عہد میں گزرے۔ طب، کیمیا اور دوسرے موضوعات پر متعدد کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ اسی طرح جابر بن حیان نے اگرچہ عباسی عہد میں شہرت پائی۔ لیکن اس کی زندگی کے ابتدائی حصہ کا تعلق اموی عہد سے ہے۔ اسی عہد کے اساتذہ کے فیضان سے اس کے اندر علم کا ذوق پیدا ہوا۔ ابن ندیم کے مطابق امام جعفر صادق سے اس کا تعلق رہا ہے۔ اس کے زمانہ کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک روایت ظاہر کرتی ہے کہ ۶۸۵ء میں وہ خالد بن یزید کی حیات میں موجود تھا۔ جابر سے کافی تعداد میں کیمیا کی کتابیں منسوب ہیں۔ جن میں سے بہت سی کتابوں کی نسبت محل نظر ہے۔

اموی حکومت صرف ۹۱ سال قائم رہی اور ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء میں اس کے خاتمہ پر بنو عباس سریر آرائے خلافت ہوئے۔ مسلمانوں کی حیرت انگیز علمی و طبی ترقیاں عباسی عہد کی یادگار ہیں۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۵۸۔۱۳۵ھ / ۷۷۴۔۷۵۲ء) طب، نجوم، ہندسہ، فلکیات وغیرہ علوم حکمت کا دلدادہ تھا۔ وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے رومی شہنشاہ کے پاس کتابوں کی فراہمی کے لئے قاصد روانہ کئے۔ شہنشاہ نے اقلیدس اور دوسری کتب طبعیات بغداد روانہ کیں اور خلیفہ کے حکم سے یونانی، رومی، پہلوی، فارسی، سریانی کی فلسفہ و حکمت کی قدیم کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے گئے۔ نجوم و فلکیات کی کتابوں کے علاوہ طب کی وہ کتابیں شامل تھیں جنہیں اہل فارس نے یونانی سے اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا تھا۔ ان مترجمین میں عبداللہ بن المقفع (وفات ۱۴۲ھ / ۷۵۹ء) طبی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

منصور ہی کے ایام خلافت میں ۱۵۶ھ / ۷۷۲ء میں ہندوستان سے ایک عالم بغداد پہنچا جو علم فلک اور علم حساب کا ماہر تھا۔ اس نے خلیفہ کے حکم سے عربی میں السند الہند الکبیر کا ترجمہ کیا۔ اسی عہد میں جرجیس (وفات تقریباً ۱۶۰ھ / ۷۷۷ء) رئیس الاطباء، جندیشاپور نے جو یونانی اور فارسی زبانوں کا فاضل تھا، یونانی اور فارسی طبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اور ایک کناش تالیف کی۔ بعد میں اس خاندان کے تراجم و تالیفات کے ذریعہ عظیم الشان طبی خدمات انجام پائیں۔

عربوں نے بلاد روم کی فتح کے وقت وہاں کے علوم و معارف اور کتابوں کے ساتھ وہ حشر نہیں کیا، جو ہسپانیوں نے فتح اندلس کے وقت، یا تاتاریوں نے بغداد اور وسط ایشیا کے دوسرے اسلامی ملکوں کی تاراجی کے بعد عربی کتابوں کے ساتھ کیا۔ چنانچہ ہارون رشید (۸۰۸-۷۸۶ء) کے زمانہ میں عموریہ اور انقرہ کی فتح کے بعد جب کتابوں کے ذخیرے ہاتھ آئے تو عربوں نے ان کی پوری حفاظت کی۔ طب، فلسفہ اور فلکیات کی نادر اور نفیس کتابیں بغداد لائی گئیں۔ یوحنا بن ماسویہ (وفات ۲۴۳ھ / ۸۵۷ء) جیسے وحید عصر کی تولیت میں ان کتابوں کو دیا گیا۔ اس نے ان کے تراجم کے اہتمامات کئے، اور متوکل کے عہد تک اس کی خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ ہارون کے زمانہ میں ہندوستانی طبیب منکہ نے سنسکرت سے فارسی اور عربی میں ترجمے کئے۔ اسی طرح ابن دھن جو بیمارستان برامکہ سے وابستہ تھا متعدد کتابوں کا مترجم ہے۔

مامون (۲۱۸-۱۹۸ھ / ۸۳۳-۸۱۳ء) کے عہد میں ترجمہ و تالیف کے کاموں میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور اس کے شوق اور محبت علم کی وجہ سے فلسفہ و حکمت اور طب کی بکثرت کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں۔ ان میں بقراط، افلاطون، ارسطو، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس جیسے عظیم یونانی مصنفین کی کتابیں شامل ہیں۔ مامون نے بڑی تعداد میں بلاد روم کا صدر روانہ کئے۔ جو ان ممالک سے نادر و نایاب کتابوں کے ذخیرے لے کر بغداد پہنچے۔ کتابوں کی تلاش میں بلاد روم جانے والوں میں یحییٰ بن ابی منصور مامونی کے علاوہ حنین بن اسحٰق اور قسطا بن لوقا جیسی شخصیتیں تھیں۔ قسطا بن

لوقا فاضل طبیب تھا۔ ان ملکوں سے کثیر تعداد میں کتابیں حاصل کر کے وہ شام آیا اور پھر بغداد پہنچا، جہاں ترجمہ کے کام میں مصروف ہوا۔ ابن ندیم کی شہادت ہے کہ یہ فضل و نبل میں حنین سے افضل تھا اور فن طب میں اس پر فوقیت رکھتا تھا۔

حنین بن اسحٰق ان اعاظم رجال میں ہے جس نے طب و حکمت کی کتابوں کے ترجمہ کے ذریعے عربی زبان میں ترجمے و تالیف کی شاندار روایت قائم کی۔ مامون اسے کتاب کے وزن کے برابر سونا صلہ کے طور پر عطا کرتا تھا۔ حنین کی زیر نگرانی مترجمین کی ایک جماعت بیت الحکمت میں مامور تھی۔ بعض ترجمے یونانی سے سریانی میں اور پھر عربی میں کئے جاتے تھے اور بعض یونانی سے براہ راست عربی میں ہوتے تھے۔ اسکے تلامذہ میں بیٹے اسحٰق بن حنین (وفات ۲۹۸ھ/۹۱۰ء) اور بھتیجے حبیش بن الاعسم کے علاوہ عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم، اصطفن بن بسیل، موسیٰ بن خالد، یحییٰ بن ہارون قابل ذکر ہیں۔

مامون نے روم کے بادشاہوں سے جو معاہدے کئے، ان کی شرائط میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ طب و فلسفہ کی نادر کتابیں بغداد روانہ کریں گے۔ چنانچہ میخائیل سوم قیصر روم اور اسی طرح صاحب قبرص سے ان شرائط کے تحت وہاں کا بیش قدر سرمایہ بغداد پہنچا۔ مامون نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے شاہ روم کو لکھا کہ وہ علماء کی ایک جماعت وہاں بھیجنا چاہتا ہے تاکہ وہ کتابیں تلاش کر کے لا سکے۔ اس مقصد کے لئے جو علمی سفارت روانہ کی گئی اس میں حجاج بن مطر، ابن بطریق اور سلم صاحب بیت الحکمت شریک تھے۔ انہوں نے بڑی تعداد میں کتابیں منتخب کر کے بغداد روانہ کیں، جہاں انہیں عربی جامہ پہنایا گیا۔

فلکیات و ریاضی میں محمد بن موسیٰ خوارزمی اس عہد کی نامور شخصیت ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے جبر، مقابلہ اور حساب میں کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب مامون کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ ہیئت و نجوم اور فلکیات میں سند بن علی، عباس بن سعید جوہری، خالد بن عبدالملک مروزی، یحییٰ بن ابی منصور، عبداللہ بن سہل بن نوبخت،

احمد بن محمد بن کثیر فرغانی، محمد بن موسیٰ جلیس، ماشاء اللہ منجم، عمر بن فرخان طبری، ابو جعفر بن جعفر بن سنان حرانی المعروف البتانی، احمد بن عبداللہ بغدادی المعروف بہ حبیش نہایت ممتاز تھے۔

خلیفہ مامون کی سرپرستی اور قدردانی کے اثر سے علم کا یہ شوق عام ہوا۔ چنانچہ لوگوں نے ان موضوعات سے دلچسپی لی اور بغداد میں علم کی روایت آگے بڑھی۔ اس موقع پر اولاد موسیٰ بن شاکر کا ذکر ضروری ہے۔ انہوں نے نفیس کتب کی تلاش میں کثیر رقم صرف کی، مختلف جگہوں پر علماء کو روانہ کیا اور اہم کتابوں کے ترجمے کرائے۔ موسیٰ بن شاکر کی اولاد کے لئے ترجمہ کرنے والوں میں حنین بن اسحٰق، حبیش بن الاعسم، ثابت بن قرۃ جیسے ماہرین شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مامون نے تین سو ہزار دینار ترجمے پر صرف کئے۔ بنو شاکر پانچ سو دینار ماہانہ صرف کرتے تھے۔ فتح بن خاقان نے ترجمہ و تالیف اور فراہمی کتب پر بے اندازہ دولت خرچ کی۔ محمد بن عبدالملک الزیات بھی فتح بن خاقان سے پیچھے نہیں تھا۔ وہ تراجم اور کتب پر دو ہزار دینار خرچ کرتا تھا۔ اس کے لئے بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ ان میں ایک کتاب الصوت ہے جسے حنین نے منتقل کیا تھا۔ اسی طرح احمد بن مدر نے کاتبوں اور مترجموں پر کثیر رقم صرف کی۔ ابو محمد حسن بن موسیٰ بن اخت ابی سہل بن نوبخت جو فلاسفہ و متکلمین میں شہرت کا حامل ہے، اس کے یہاں فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کرنے والوں میں شامل تھا۔

علمی اداروں کے قیام کی تاریخ کا سلسلہ مدینۃ العلم ایتھنز میں افلاطون کی "اکادمی" ارسطو کی "لی سی ایم" ٹاوفرسطس کے "میوزیم" اور اسکندریہ میں بطلیموسی شہنشاہ کے قائم کردہ دارالعلوم سے ملتا ہے۔ عربوں کے فتح مصر کے وقت بھی اسکندریہ میں دارالعلوم قائم تھا، جس سے اکابر اطباء و فلاسفہ یونان وابستہ رہے تھے۔ یحییٰ نحوی ان میں ایک ممتاز نام ہے۔ مصر میں دوسرا دارالحکمۃ اخمیم میں واقع تھا۔ مرتبہ اور شان کے لحاظ سے اس کی اہمیت اسکندریہ کے دارالعلوم سے کم نہیں تھی۔ اسی

طرح بلاد روم اور قبرص کے دار الحکمۃ اپنی اپنی جگہ رفیع المنزلت تھے۔ جن کے تراجم و تالیفات کی بدولت علم کا چراغ روشن رہا۔ ان بیوت الحکمۃ میں کتابوں کا بیش قدر ذخیرہ موجود تھا۔ عام کتب خانوں کی طرح محض کتابوں کی فراہمی و استفادہ ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ اہل علم کی ایک جماعت ان سے وابستہ تھی جو نقل و ترجمہ میں مصروف رہتی تھی۔

اسلامی عہد میں پہلے بیت الحکمت کے قیام کا اعزاز عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کو حاصل ہے، جس نے بغداد میں اس کی بنیاد رکھی۔ اس ادارہ نے ہارون رشید کے مختصر زمانہ میں اور پھر مامون کے عہد میں شہرت پائی۔ اس بیت الحکمت کے ذریعہ اشاعت و ترقی علم کے جو کارہائے عظیم انجام پائے، اور انسانی تاریخ پر ان کے جو زبردست علمی و تہذیبی اثرات مرتب ہوئے، قدیم اداروں کے مقابلے میں ان کی وسعت کہیں زیادہ ہے۔ بیت الحکمت کے زیر اثر اسلامی دنیا میں علم کا جو عام مذاق پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں اس قسم کے متعدد ادارے وجود میں آئے۔ تیونس میں غالبی حکمرانوں کے زیر اہتمام شمالی افریقہ میں قیروان میں تیسری صدی ہجری میں بیت الحکمۃ قائم ہوا۔ اسحٰق بن عمران نے اس بیت الحکمۃ کی عظمت کو دوبالا کیا۔ زیادۃ اللہ سوم (۲۹۶-۲۹۰ھ / ۹۰۸-۹۰۲ء) اس کا موسس تھا۔ فاطمیوں نے قاہرہ میں ۳۹۵ھ / ۱۰۰۴ء میں ایک دار الحکمۃ قائم کیا تھا۔ مقریزی نے اس ادارہ میں چھ لاکھ کتابوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے بڑا کتب خانہ پورے عالم اسلام میں کہیں نہیں تھا۔ مطالعہ کتب کے علاوہ تصنیف و تالیف، درس و تدریس، مناظرہ و مذاکرہ کا سلسلہ رہتا تھا۔ حساب، منطق، فقہ اور طب چار علوم کے ماہرین خاص طور پر اس ادارہ سے متعلق تھے۔ آل عمار نے پانچویں صدی ہجری میں شام کے شہر طرابلس میں ایک دار العلم قائم کیا اس کا بانی امین الدولہ ابو طالب حسن بن العمار (وفات ۴۶۴ھ / ۱۰۷۱ء) تھا۔ یہ ادارہ بعد میں صلیبیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ یہ بیوت الحکمۃ ثقافت کے اعلیٰ مراکز تھے۔ طب، فلسفہ، منطق، نجوم، ریاضی اور دوسرے علمی

موضوعات پر وہاں کتابیں ترجمہ کی گئی تھیں۔ اندلس میں جو کام انجام پایا وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔

ذاتی طور پر شائقین اور علم دوست اشخاص نے بھی اس قسم کے اداروں کے قیام میں دلچسپی لی۔ موصل میں جعفر بن محمد بن حمدان (۳۳۲۔۲۴۰ھ / ۹۴۳۔۸۵۴ء) کا دارالعلم، عراق میں "کرکر" کے مقام پر ابوالحسن علی بن یحییٰ بن ابی المنصور منجم (وفات ۲۷۵ھ / ۸۸۸ء) کا خزانۃ الحکمۃ، نیشاپور میں قاضی ابن حبان البستی (وفات ۳۵۴ھ / ۹۶۵ء) کا دارالعلم ممالک اسلامیہ کے ممتاز اداروں میں تھے۔ خلیفہ متوکل علی اللہ (۸۶۱۔۸۴۶ء) کا وزیر فتح بن خاقان جو ادب، فلسفہ، نجوم اور طب کا عالم تھا اس کے مکان پر علمی مجالس منعقد ہوتی تھیں اور مباحثات و مذاکرات کا سلسلہ رہتا تھا۔ کتابوں سے شدید محبت اور کثرت مطالعہ کے لیے مشہور ترین تین ناموں جاحظ، اسمٰعیل بن اسحٰق قاضی میں تیسرا نام فتح بن خاقان کا ہے۔ ترجمہ، تالیف اور نقل کتب پر اس نے بے دریغ دولت صرف کی۔ ابن مارستانیہ (وفات ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء) بغداد کے بیمارستان عضدی سے وابستہ تھا، اس نے اپنے مکان پر بڑی تعداد میں کتابیں فراہم کی تھیں۔ دارالعلم کے نام سے اس کی حیثیت ایک باقاعدہ ادارہ کی تھی، جہاں پہنچ کر طلبہ اور شائقین کتب استفادہ کرتے تھے۔ مراغہ میں نصیر الدین طوسی (وفات ۶۷۲ھ / ۱۲۷۲ء) نے ہلاکو کی سرپرستی میں جو رصدگاہ اور دارالحکمۃ قائم کیا تھا اور جس میں عراق اور شام سے چار ہزار باقی ماندہ کتابیں فراہم کی تھیں، اس نے علوم و فنون کی توسیع میں خاص حصہ ادا کیا۔ علوم حکمیہ، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، اور نجوم کے ساتھ طب میں بھی وہاں کام کیا گیا تھا۔ اس دارالحکمۃ سے جو اہل علم وابستہ تھے ان میں مہندسین کے لئے تین درہم، اطباء کے لئے دو درہم، فقہا کے لئے ایک درہم اور محدثین کے لئے نصف درہم روز مقرر تھا۔ قطب الدین شیرازی اور رکن الدین استر آبادی جیسے لوگ اس ادارہ سے وابستہ رہے۔

عربوں میں انتقال علوم کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جواں

سال ذی علم طبیب وسیم احمد اعظمی نے "بیت الحکمۃ کی طبی خدمات" کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے قبل از اسلام، عہد نبوی اور عہد اموی کی مختصر طبی روئداد کے بعد عہد عباسی کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور بیت الحکمۃ کے مترجمین اور ان کے تراجم واثرات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام طب کے علاوہ دوسرے علوم کی جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ نقد و نظر اور تراجم کے معیار کے بارے میں جائزہ اسی طرح مترجمین میں ہندوستانی، ایرانی اور مسلم ترجمہ نگاروں پر علیحدہ سے لکھا ہے۔ انہوں نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے اس موضوع پر مواد فراہم کیا ہے اور جس سلیقہ سے اسے ترتیب دیا ہے وہ ان [illegible]ق علم اور تاریخ طب سے ان کی آگاہی کو ظاہر کرتا ہے۔ طبی تاریخ کی سلسلہ کے یہ ایک [illegible] رکتاب ہے۔ مجھے امید ہے کہ علمی حلقوں کی طر[illegible] اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

۲۰/ مارچ ۱۹۸۶ء

○○

تقدمہ علوم وثقافت اسلامیہ

دنیا کو علم سے آراستہ اور متمدن بنانے میں اسلام نے نہایت بیش قرار اور گراں بہا حصہ ادا کیا ہے۔ قرآن کریم کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے علم کی محبت و شیفتگی پیدا کی ہے اور انسان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو ابھارا ہے۔ **قل انظروا مافی السمٰوت والارض** (یونس:۱۰۱) **و فی انفسکم افلا تبصرون** (الذاریات:۲۱) قرآن میں علم و حکمت کے الفاظ بکثرت وارد ہوئے ہیں۔ **ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً** (البقرہ:۲۶۹) جو علم و حکمت سے سرفراز ہوا گویا اسے خیر کثیر مل گیا۔ **و یعلمهم الکتاب و الحکمة** (آل عمران:۱۶۴) "اور ان کو کتاب و حکمت کی باتیں بتاتے ہیں۔" متعدد مواقع پر حقائق کی معرفت، نظام کائنات کے مطالعہ، عقل و فہم اور شعور و ادراک کی دعوت دی گئی ہے۔ **ویتفکرون فی خلق السموات والارض** (آل عمران:۱۹۱) **اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض و ما خلق الله من شی** (الاعراف:۱۸۵) علماء اور محققین جن پر کائنات کے اسرار اور عالم وجود کی عظمت آشکار ہوئی ان کے لیے ارشاد ہے۔ **انما یخشی الله من عباده العلماء** (فاطر:۲۸) یہ بہت بلیغ آیت ہے اور اس کی وسعتوں میں معانی کی ایک دنیا ہے۔ یورپ میں ایک فاضل محقق کی نظر سے جب یہ آیت گزری تو وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یقیناً یہ کلامِ الٰہی ہے ورنہ چودہ سو برس پہلے محمد کی زبان سے یہ فقرہ نہیں ادا ہو سکتا تھا۔ قرآن میں علم کی اہمیت کے لئے جہاں اس کی پہلی آیت اقراء (علق:۱) سے شروع ہوئی ہے اور **علم الانسان مالم یعلم** (علق:۵) کہا گیا ہے وہاں قلم کی عظمت و تقدیس بیان کرتے ہوئے اسے تعلیم و تعلم کا نشان قرار دیا گیا ہے۔ **الذی علم**

مطبوعہ انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

بالقلم (علق:۴) والقلم ومایسطرون (القلم:۱) علم و تحقیق کے بغیر اتباع و تقلید سے منع کیا گیا ہے۔ ولاتقف مالیس لك به علم (بنی اسرائیل:۳۴)

رسول کریم ﷺ نے بھی علم کی خاص ترغیب دی ہے۔ فرمایا ہے: من یطلب العلم یتقرب الی الله. علم کی فضیلت کے لیے ارشاد ہوا فضل العلم خیر من فضل العبادة۔ دوسری روایت میں آیا ہے۔ قلیل من العلم خیر من کثیر العبادة. صاحبان علم کے اکرام واحترام کے لیے تاکید فرمائی ہے۔ اکرموا العلماء۔ تعلیم کو عام کرنے پر آپ کی پوری توجہ مبذول رہی۔ فرمایا ہے کن عالما و متعلما ولاتکن الثالثه ای جاهلاً۔ علم کی حفاظت اور تصنیف و تالیف کی طرف رغبت دلاتے ہوئے فرمایا ہے۔ قیدوا العلم بالکتابة. مصنفین کے قلم کی روشنائی کو شہداء کے خون سے بہتر قرار دیا والمداد جرت به اقلام العلماء خیر من دماء الشهداء۔ طلب علم کے مرتبہ وشان کو بلند کرتے ہوئے فرمایا ہے ان الملئکة لتضع اجنحتها لطالب العلم رضیً۔ علم کے چھپانے پر ان الفاظ میں وعید فرمائی ہے من کتم علما الجه الله بلجام نار۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو معتقدات کی دولت گراں مایہ کے علاوہ علوم وفنون اور تہذیب و تمدن سے سرفراز اور مالا مال کیا ہے۔ ذہنی اور اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے قرآن و سنت میں انسانوں کی ہدایت کے لیے پیش نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح اسلام کے ذریعہ جو نظام اقدار وجود میں آیا اس سے روحانی ترقی کے ساتھ دنیا میں عظیم مادی و فکری انقلاب رونما ہوا۔ صدر اسلام ہی سے مسلمانوں کا علم و ہنر اور تہذیب و ثقافت سے رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ ان کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ان کی کسی حکومت اور ان کے زیر نگیں کسی ملک میں علم سے بیزاری، مخالفت یا اہل علم کے احترام میں کمی کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ بنوامیہ کے ابتدائی عہد سے علمی و فنی سرگرمیوں کا جس اہتمام سے آغاز ہوا، عباسی عہد میں وہ عروج و کمال پر پہنچا۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے فروغ، علوم و فنون کی ترقی، ترویج و اشاعت اور ایجاد و اختراع میں انہوں نے

بہترین صلاحیتوں اور دماغی کاوشوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ خلفاء اور مسلم حکمرانوں کی علم دوستی اور قدر افزائی کی وجہ سے محققین اور علماء فن کو زیادہ فراغت خاطر کے ساتھ کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے بھی علوم و ثقافت کی نشو و نما اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

مسلمانوں کی بیش بہا تخلیقات و اکتشافات کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے شاندار کارناموں کے ذریعہ عالم انسانیت پر جو گہرے نقوش ثبت کیے ہیں اور تاریخ اقوام میں جو مرتبہ اور مقام بلند انہیں حاصل ہے، اس پر مورخین نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ داستان بہت لذیذ اور روح پرور ہے۔ اس سے جہاں قلب و نظر میں تازگی اور ذہن و فکر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، وہاں اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کو دہرانے والے ہر مصنف کے یہاں نئی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

اس موضوع پر اردو میں بھی کافی سرمایہ فراہم ہے اور بہت سے لوگوں نے مختلف انداز سے اس روئداد کو قلم بند کیا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں کی تالیف ''قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات'' اس سلسلہ کی ایک اچھی کڑی ہے۔ حکیم اسلم صاحب کے یہاں یہ داستان کچھ اور جمیل بن کر سامنے آئی ہے۔ ان کے اسلوب نگارش اور طرز ادا نے اس میں دلکشی کے نئے سامان پیدا کئے ہیں۔ مسلمانوں نے علم کی ہر شاخ اور صنعت کے ہر شعبہ میں اس قدر کام کیا ہے کہ کسی ایک مصنف کے لیے اس کا احاطہ اور اس پر سیر حاصل تبصرہ آسان نہیں ہے۔ اس موضوع پر کوئی کتاب جامع نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی پیش نظر کتاب میں بہت سے عنوان اور ضروری واقعات آگئے ہیں۔ اور مسلمانوں کے علمی و تمدنی جاہ و جلال کی جھلکیاں اس میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس منظر نامہ کے ذریعہ مولف نے جو فضا پیدا کی ہے، اس سے نئی تعلیم یافتہ نسل کی نگاہ میں مسلمانوں کا روشن رخ نمایاں ہو کر ان کا وقار بڑھتا ہے۔

اس کتاب میں دینی موضوعات بالخصوص کتاب و سنت کے سلسلہ میں اسلامیان عالم کی مہتم بالشان کاوشوں کے علاوہ علوم و فنون میں ریاضی، جبر و مقابلہ، ہیئت،

طبعیات، کیمیا، نباتات، حیوانات، جغرافیہ، طب، ارضیات، معاشیات، تجارت، تاریخ، اسی طرح ان کی اہم ایجادات واختراعات پر مستند مآخذ کی روشنی میں لکھا ہے۔ مشرقی و مغربی دنیا پر اس کا نفوذ، دوسرے مذاہب سے تقابلی مطالعہ، کلیسا کا عیسائی علماء کے ساتھ ناروا سلوک اور ان عطیات واثرات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جو اسلام نے ہندی تہذیب پر مرتب کیے ہیں۔ مغربی مورخین کے اعترافات کے ذریعہ کتاب کو مزید موقر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح مختلف زمروں سے تعلق رکھنے والے اہم اشخاص، تصانیف، ان کے نمایاں کاموں، دریافتوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی خدمات پر مشتمل وہ ضروری مواد سامنے آگیا ہے جسے پڑھ کر مسلمانوں کے روشن ماضی اور ان کے شاندار کارناموں کا تعارف حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ علوم اور تاریخ ثقافت کے جھروکوں سے زیادہ مولف کا مقصد ان عظیم الشان کاموں کو یاد دلا کر مسلمانوں کے ذہن و ضمیر کو جھنجھوڑنا اور ان میں وہ ولولہ اور تڑپ پیدا کرنا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا۔ مسلمانوں کے علمی و تمدنی اقبال کا رشتہ دراصل ان کے سیاسی اقتدار سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے سیاسی زوال کے ساتھ ان کی علمی و فنی سرگرمیاں بھی دم توڑ گئیں اور وہ ذوق و ذہن جاتا رہا جس سے ان کی علمی سیادت اور بالادستی قائم تھی۔ ادھر جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور مسلمانوں میں جو ایک نئی فکری و تعمیری لہر آئی ہے اس سے یہ توقع بے جا نہیں ہوگی کہ مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پھر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کریں گے اور زندہ و توانا قوم کی صف میں ان کا شمار ہوگا۔

حکیم محمد اسلم صدیقی میرے مخلص و محترم اور استاد شفیق شفاء الملک حکیم عبداللطیف مرحوم کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انتظامی مصروفیتوں کی نذر ہوا۔ لیکن اسلامیات، طب، زبان وادب اور تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کے مطالعہ کا جو ذوق ان میں طالب علمی کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا، وہ دفتری اور انتظامی مشغولیتوں میں بھی جاری رہا۔ ہندوستانی

مطبوعات کے علاوہ پاکستان کے ممتاز مصنفین کی معیاری کتابیں ان کی نظر سے گزرتی رہیں۔ ان کے منگانے کا اہتمام بھی رہا۔ کتابوں کے مطالعہ کے دوران وہ یادداشتیں قلم بند کرتے رہے۔ یہ یاد داشتیں ان کے بہترین مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپنے وقت کا بہت اچھا مصرف یہ تلاش کیا کہ ان یادداشتوں کو مزید مطالعہ کے بعد مرتب کر ڈالا۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف نقوش و تاثرات، شمع رسالت کے چند پروانے، اسوہ نبی رحمت اور 'عورت اسلام کی روشنی میں، کے بعد یہ ان کی پانچویں کاوش ہے' جو منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔ یہ کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ جلد ہی ان کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور ان میں سے بعض دوبارہ طبع ہوئیں۔ اسلم صاحب کی تحریر بڑی جامع اور شگفتہ ہے۔ وہ واقعات کو اس طرح دلچسپ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اس کا خوش گوار اثر پڑھنے والے کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے۔ زبان پر گرفت اور طرز نگارش کی یہ خوبی اس کتاب کے صفحات میں نمایاں ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس جذبہ و خلوص سے اس کتاب "علوم و ثقافت اسلامیہ" کی تالیف عمل میں آئی ہے اسی جذبہ سے اسے پڑھا جائے گا اور اس سے ان مقاصد کی تکمیل میں مدد ملے گی جو مولف کے پیش نظر رہے ہیں۔

۱۵ر نومبر ۱۹۹۱ء

OO

تقدمہ سرجری اسلام کے قرون اولیٰ میں

طب کی جن شاخوں میں اطبائے قدیم نے اپنی گراں قدر کاوشوں کے ذریعہ اہم اضافات کئے ہیں، اور جن مضامین کی نشو ونما اور ترقی ان کی مساعی علمیہ کی رہین منت ہے، ان میں علم تشریح اور علم جراحت میں انکی خدمات کا کم سے کم اعتراف کیا گیا ہے۔ عام مغربی مورخین نے ان مضامین میں ان کی معلومات کو ابتدائی درجہ میں قرار دیا ہے، اور ان کی کوششوں کے میدان کو بہت تنگ بتایا ہے۔ اگر یہ بات تشریح اور جراحت کی موجودہ ترقیات کی روشنی میں کہی جارہی ہے، اور قدیم وجدید کے موازنہ کے ذریعہ نقد وتبصرہ مقصود ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ انداز فکر نہ صرف تشریح وجراحت اور طب کے دیگر مضامین کے سلسلہ میں، بلکہ کسی بھی دوسرے علم وفن کے مطالعہ میں صحیح نہیں ہوگا۔ عہد حاضر کا عہد قدیم سے مقابلہ، اور قدما کی قدر ومنزلت اور ان کے علم وتحقیق کو کم ثابت کرنے کی کوشش، صحت مند ذہن اور اصول نقد ونظر کے منافی ہے۔

علوم وفنون کی موجودہ ترقیات کا دائرہ نہ کسی ایک شعبہ علم کی ترقی تک محدود ہے، اور نہ کسی ایک مضمون کے محققین کے سر ان کا سہرا باندھا جاسکتا ہے۔ ارتقائے علوم کا یہ عمل نظام کائنات کے سلسلوں سے مربوط ہے۔ یہ برابر جاری ہے اور اسے جاری رہنا چاہئے۔ فن جراحت میں اطبائے قدیم کی مہارت اور دسترس کا جہاں تک تعلق ہے، اسے ان کے زمانہ کے دوسرے علوم کی معلومات سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اپنے عہد میں انہوں نے اس فن کو کتنا آگے بڑھایا، اور اس کی ترقی میں ان کی کوششیں کس درجہ صرف ہوئیں۔ اس عہد کی علمی وسعتوں کے آئینہ میں ان کے عکس ہی سے ان کی کاوشوں کا اندازہ ہوسکے گا۔

تاریخ طب کے ابتدائی زمانہ سے فن جراحت کا سراغ ملتا ہے۔ اس کی ابتدا اگرچہ دوائی طریقہ کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن قدیم مصری، بابلی، ہندی اور یونانی طب میں علاج امراض کے ساتھ اعضاء کی جراحت کے عمل کی انجام دہی ثابت ہے۔ اڈون اسمتھ پیپائرس جراحیات کے سلسلہ کے قدیم ترین نوشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا زمانہ ڈھائی ہزار برس قبل مسیح سے پہلے کا ہے۔ اس میں جراحی کے متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ مجموعہ قوانین حمورابی سے بھی جراحت کے بارے میں قدیم ترین معلومات کا اظہار ہوتا ہے۔ فوج سے جراحوں کی وابستگی اور زخموں کے علاج میں ان کی ذمہ داری پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے۔ قدیم زمانہ میں پلٹس، لیپ، مرہم کا استعمال عام تھا۔ مرہموں کا خاص جزء چربیاں تھیں۔ دوا لگا کر پٹی بھی باندھی جاتی تھی۔ مجریٰ بول میں تانبہ یا جست کی نلیوں سے دوا داخل کی جاتی تھی۔ فرج میں دوا ڈالنے کے آلات تھے۔ اسقلبیوس جو یونانی طب کی تاریخ کا پہلا نام ہے اس کے دو بیٹے ماخون اور بدرلیوس ٹرائے کی جنگ (۱۱۸۴۔ ۱۱۹۲ق م) میں یونانی فوج میں سرجن کی حیثیت سے شریک تھے۔ ہومر جس کا زمانہ نویں صدی قبل مسیح کا ہے اور جس کی نظموں کے ذریعہ یونانی طب کے بارے میں پہلی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی نظمیں پیشہ ور طبیبوں کی طب اور سرجری میں پہلے سے ترقی یافتہ پریکٹس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ان میں زخموں اور ان کے مابعد اثرات اور علاج کا بہت صحیح بیان ہے۔ درد دور کرنے والی اور زخم بھرنے والی دوائیں ذکر کی گئی ہیں۔ ہومر نے ۱۴۱ قسم کی جراحتیں بیان کی ہیں۔ جن میں سر، گردن، صدر، مثانہ اور عمود فقری کے زخم اور عظم الفخذ کا کسر شامل ہے۔

بقراط (۴۶۰ق م) نے جہاں فن طب کی تنظیم و تہذیب کا فریضہ ادا کیا وہاں سرجری میں بھی اپنے شغف کا ثبوت دیا۔ بعض بے حد اہم اعمال اس سے منسوب ہیں۔ مثلاً Trephining اور پیٹ کی Tepping وغیرہ۔ ماہر تشریح ایراسیسطراطوس (۳۰۴ق م) سرجری میں بے دھڑک پریکٹس کرتا تھا اور جگر اور طحال کے پھوڑوں کے لئے پیٹ کھولنے میں اسے کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی۔

یونانیوں میں میٹس، اپولوفینس، ہیکٹیر جراحت پر اپنے کاموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ کیلسس نے سرجری پر خاص طور سے لکھا ہے۔ اس کی طبی کتاب کا ساتواں اور آٹھواں حصہ علم جراحت سے متعلق ہے۔ آرکے جینس (۱۱۷۔۴۸ء) نے شریان کے کٹ جانے پر عروق کی بندش یا عمل جراحی کے بعد خون بند کرنے کے لئے شریان کے سروں کو موڑنے کا طریقہ شروع کیا۔ اور جریان خون کے لئے موجودہ داغنے کے عمل کو اختیار کیا۔ مارینس (دوسری صدی کی ابتدا) نے ہڈی میں سوراخ کرنے کی تکنیک (Bone Drilling) کو ترقی دی۔ جالینوس نے بتایا کہ الفاظ کی یادداشت دماغی جراحتوں کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے دماغ مقدم کے صدمات اور دماغ موخر کے صدمات سے پیدا ہونے والے مختلف اثرات بیان کئے۔ اس نے عصب راجع کے کٹنے اور آواز کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے اس کے افعال متعین کئے۔ اس کا تجربہ اسے اس طرح ہوا کہ اس نے دیکھا کہ عصب راجع کے کٹنے کے بعد ایک سور چیں چیں کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی طرح مبدالنخاع کے کٹ جانے کی وجہ سے اس نے عمل تنفس کی رکاوٹ کا علم حاصل کیا۔ وہ تجربات جو عضلات بین الاضلاع یا ان کے اعصاب کے کٹنے، پسلی کی تقطیع، نخاع کی عرضی تراش (حجاب حاجز کا فالج) پر مشتمل تھے، ان میں صدر کے جروح نافذہ کے مشاہدات سے مزید اضافہ ہوا۔ ان سب نے مل کر اس امر کی طرف رہنمائی کی کہ آرام و سکون کی حالت کا تنفس زیادہ تر حجاب حاجز کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اور قوت اور زور کے وقت تنفس میں عضلات بین الاضلاع بھی حصہ لیتے ہیں۔ جالینوس نے ایک لڑکے پر جس کی عظم القص، تاکل العظام کی وجہ سے ضائع ہو گئی تھی، بطن کے محتویات کا امتحان کرتے ہوئے قلب کی حرکت کا معائنہ کیا تھا۔ جالینوس اور اسی طرح بولس (۶۴۰ء) کے تشریحی و جراحی کارناموں نے اس فن کی ترقی میں خاص حصہ ادا کیا ہے۔

قدیم عرب میں علاج کے دو طریقے رائج تھے۔ ایک علاج بالدواد دوسرے علاج بالید اس کے مطابق معالجین کے پاس علاج کے دو بکس رہتے تھے۔ ایک میں دوائیں

اور دوسرے میں جراحی آلات اور ان سے متعلق دیگر سامان ہوتا تھا۔ فصد، حجامت، کئی اور بتران کے اعمال میں شامل تھے۔ آخر الدواء الکی ان کا مشہور مقولہ تھا۔

عہد اسلامی میں دوسرے علوم کی ترقیات کے ساتھ سرجری کو بھی امتیاز حاصل ہوا۔ آنحضرت کے زمانہ میں طب کے ساتھ جراحت کی پریکٹس جاری تھی۔ ابن ابی رمثہ تمیمی عہد نبوی کے طبیب و جراح جب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو گوشت کا ابھار سمجھ کر آپ سے آپریشن کی اجازت چاہی تھی۔

حضرت علی پر جب قاتلانہ حملہ ہوا اور سر پر تلوار کی کاری ضرب لگی تو ان کے ارد گرد متعدد اطباء اور جراح جمع ہوئے، ان میں اثیر سب سے قابل جراح تھے انہوں نے ان کے زخمی سر میں ایک نلکی داخل کر کے اسے منہ سے چوسا۔ مخ دماغ کا حصہ اس کے ساتھ آنے پر انہوں نے زخم کے مہلک ہونے اور جانبر نہ ہونے کی بات کہی۔

اسلامی فوجوں کے ہمراہ اطباء اور جراح موجود رہتے تھے۔ حضرت عمر کے زمانہ میں ایران پر لشکر کشی کے وقت مورخین نے اطبا اور جراحوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ فوج کے اسٹاف میں اطباء اور جراح ضرور شامل رہتے تھے۔ وہ زمانہ تلوار کی لڑائی کا تھا۔ جنگوں میں زخمی زیادہ ہوتے تھے، مرتے کم تھے۔ تاریخ میں کہیں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ کسی جنگ میں جو سیکڑوں افراد زخمی ہوئے وہ سب مناسب جراحی امداد نہ ملنے کے سبب ختم ہو گئے۔ حضرت جعفر طیار کی شہادت کے وقت ان کے زخموں کا شمار کیا گیا تو ۹۰ زخم تلواروں اور نیزوں کے ان کے جسم پر تھے۔ مشہور سپہ سالار حضرت خالد بن ولید کے جسم پر کاری زخموں کے اس کثرت سے نشان تھے کہ ایک بالشت حصہ بھی ان سے خالی نہیں تھا۔ مگر انتقال کے وقت یہ سب زخم بھر چکے تھے۔ اس سے اس عہد میں جراحت کی عملی شکل کا اظہار ہوتا ہے۔

صحیح احادیث کے مطابق عرفجہ بن اسعد کی ناک ایک جنگ میں ضائع ہو گئی تھی۔ انہوں نے چاندی کی ناک بنوائی لیکن جب اس میں عفونت پیدا ہو گئی تو آنحضرت نے

انہیں سونے کی ناک بنوانے کا مشورہ دیا اور روایات میں ملتا ہے کہ پھر انہوں نے سونے کی ناک بنوائی۔ سونے سے دانت بندھوانے اور دانتوں میں سونا بھرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت انس، حضرت عبداللہ بن عون اور حضرت موسیٰ بن طلحہ اکابر صحابہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

علی بن ربن طبری (۸۶۱۔۸۰۷ء) محمد بن زکریا رازی (۹۲۵۔۸۶۵ء) علی بن عباس (۹۹۴۔۹۳۰ء) ابو سہل (۱۰۱۰۔۹۷۱ء) ابن سینا (۱۰۳۷۔۹۸۰) اسماعیل جرجانی (۱۱۳۵۔۱۰۴۱ء) ابن زہر (۱۱۶۱۔۱۰۹۰) نجیب الدین سمرقندی (وفات ۱۲۲۱ء) ابن نفیس (۱۲۸۸۔۱۲۱۰ء) برہان الدین نفیس (وفات ۱۳۴۷ء) بہاء الدولہ (وفات ۱۵۰۷ء) اور کم و بیش ہر قابل ذکر مصنف کی کتاب میں جراحت کے ابواب شامل ہیں۔ اگر ان ابواب کو جمع کیا جائے تو اس موضوع کی کافی معلومات سامنے آسکتی ہیں۔ بعض ماہرین نے مستقل کتابیں بھی سپرد قلم کی ہیں۔ ابوالقاسم زہراوی (وفات ۱۰۳۱ء) کی کتاب التصریف اور ابن القف (۱۲۸۶ء) کی کتاب العمدۃ فی الجراحت اور حکیم محمد کی ذخیرہ کاملہ اس سلسلہ کی بہترین مثالیں ہیں۔ رسالۃ فی الجراحۃ، رسالۃ الکی، کتاب الکسر و الجبر اور کتاب الفصد والحجامۃ کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ محمد تمیمی کی کتاب فتق اور رسولی پر تقریباً چار سو صفحات پر محیط ہے۔ ابوالقاسم زہراوی، ابوالحکم کرمانی (وفات ۱۰۶۵ء) شیخ سدید ابوالمنصور (وفات ۱۱۹۵ء) الخیر النافع، ابن عکاشہ، ابونصر بن مسیحی، ابوالبرکات بن قضائی (وفات ۱۲۰۱ء) ابن وصف صابی، نفیس الدین بن الزبیر، ہارون بن موسیٰ الاشیونی، علی الصدر اصفہانی، شرف الدین بن صابونی، ابن ہمدان ان بکثرت لوگوں میں ہیں جو مشاق جراح اور اعمال بالید میں ماہر تھے۔ اور جن کے نام جراحی میں ان کی مہارت کی وجہ سے تاریخ میں محفوظ ہیں۔

زہراوی، ابن القف اور دوسرے عرب ماہرین جراحت کے کارناموں پر بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے اور کافی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ابتدائی اسلامی عہد کے فن جراحت کے مطالعہ پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ

مولانا عبداللہ طارق دہلوی رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے اسے اپنے قلم کا موضوع بنایا اور بڑی تحقیق اور کاوش سے بکھری ہوئی معلومات جمع کیں۔ انہوں نے اس کے لئے تاریخ کی کتابوں کے علاوہ دوسرے مستند ذرائع سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جو ماخذ ان کے پیش نظر رہے ہیں وہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان پر عام مورخین کی نگاہ نہیں گئی ہے۔ انہوں نے پیش نظر کتاب "سرجری اسلام کے قرون اولیٰ میں" عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بالخصوص اس فن کی ترقی کا جائزہ لیا ہے اور یہی اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ اس دور کی طبی اور جراحی معلومات کے تعلق سے یہ کام انہوں نے جس ذمہ داری اور شغف سے انجام دیا ہے وہ ان کے تاریخی اور علمی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ طب کے سلسلہ کی اس مفید کوشش کے لئے وہ اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اپریل ۱۹۸۳ء

OO

تقدمہ طبی لغت

ابتدائی عربی عہد میں یونانی، سریانی اور دیگر قدیم اقوام کا سرمایہ عربی میں منتقل کیا گیا۔ جن افراد نے اس ذخیرہ کو عربی جامہ پہنایا وہ ان زبانوں پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ اور مترجمین کی ایک مخصوص جماعت اس کام کو انجام دے رہی تھی۔ طبع زاد عربی مصنفین کی پہلی صف کے افراد کے یہاں ماخذ کی ان زبانوں سے واقفیت کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ محمد بن زکریا رازی اور ابن سینا جو یونانی علوم کے بہترین نمائندہ تھے اور جنہوں نے یونانی معلومات اپنے گراں قدر اضافات کے ساتھ عربی میں پیش کیں، اور جن کے یہاں نہ صرف یونانی و سریانی یا ایرانی بلکہ ہندی حوالے بھی موجود ہیں، ان زبانوں سے تقریباً ناآشنا تھے اور ان کے پیش نظر محض ترجمہ شدہ عربی کتابیں تھیں۔

عربی پوری اسلامی دنیا کی علمی زبان اور عام اظہار خیال کا ذریعہ تھی۔ ایران، ترکستان، افریقہ اور دوسرے ممالک کے مصنفین اپنی تصانیف عربی میں پیش کر رہے تھے۔ علمی فضیلت و مقبولیت کے ساتھ ہی اس کا حلقہ بہت زیادہ وسیع تھا۔

عام طبی مضامین کے لیے مختلف مقامی زبانوں کی اہمیت نہیں تھی، اس لیے کہ ان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ وسیع پیمانہ پر شروع نہیں ہوا تھا۔ لیکن علم الادویہ کے سلسلے میں ادویہ کے مقامی ناموں کی وجہ سے ہم معنی نام اور مترادفات کی اہمیت تھی۔ اسی لیے طب کی عام قاموس یا لغت کے مقابلہ میں ادویہ کے مترادف ناموں پر پہلے توجہ دی گئی۔ اور اکثر مصنفین نے عربی کے علاوہ دوسری مشہور اور مروج زبانوں کے ناموں کی تحقیق کی اور انہیں اپنی کتابوں میں درج کرنا ضروری سمجھا۔ اسامی ادویہ پر ان مصنفین نے جو تحقیقی کام کیا ہے وہ نہ صرف علم الادویہ کے تعلق سے بلکہ لسانی اور لغوی نقطہ نظر سے بے حد عظیم الشان ہے۔ قدیم یونانی ادویہ کے ناموں کی تشریح و

توضیح میں دیسقوریدوس (وفات ۷۰ء کے بعد) کی مصور کتاب الحشائش کا انتخاب کیا گیا جو یونانی ذخیرہ علم الادویہ کی شاہکار تصنیف تھی۔ چنانچہ ابن جلجل (۱۰۰۹-۹۷۶) نے کتاب تفسیر اسماء الادویۃ المفردۃ من کتاب دیسقوریدوس کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ شہرہ آفاق ماہر نباتات ابوالعباس ابن رومیہ (۱۲۳۹-۱۱۶۵ء) کی تفسیر اسماء الادویۃ المفردۃ من کتاب دیسقوریدوس بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اسی طرح جالینوس کی کتاب الادویۃ المفردۃ کے ناموں کی تحقیق اور مترادفات پر حنین بن اسحٰق نے کتاب فی اسماء الادویۃ المفردۃ سپرد قلم کی۔

علم الادویہ کے جن عربی مصنفین نے دوسری زبانوں کے ناموں کا خاص التزام کیا ہے، ان میں ابن میمون (۱۲۰۴-۱۱۳۵ء) کی تصنیف زیادہ بہتر ہے۔ اس میں متعدد زبانوں میں ادویہ کے نام درج ہیں اور ۴۰۸ مشہور دواؤں کا تذکرہ شامل ہے۔ ابن میمون نے خود وضاحت کی ہے کہ اس نے ابن جلجل (۱۰۰۹-۹۷۶ء) ابن جناح (وفات ۱۰۴۰ء کے بعد) ابن وافد (ولادت ۹۹۹ء وفات ۱۰۶۸ء کے بعد) حامد بن سمجون (اوائل گیارہویں صدی) اور الغافقی (وفات ۱۱۶۵ء) سے یہ معلومات اخذ کی ہیں۔

ابوریحان البیرونی (۱۰۴۸-۹۷۲ء) کی کتاب الصیدنہ اس سلسلے کی بہت اہم تصنیف ہے۔ اس میں مصنف نے پہلے مفرد دوا کا مشہور نام لکھا ہے اس کے بعد یونانی، سریانی، جرجانی، خوارزمی، عراقی، فارسی اور مختلف ہندی بولیوں کے مترادف نام تحریر کیے ہیں۔

بعد کے عرب مصنفین کا بھی یہی انداز رہا۔ شیخ داؤد بن عمر انطاکی (وفات ۱۵۹۷ء یا ۱۵۹۹ء) نے اپنی کتاب تذکرہ اولوالالباب میں مثال کے طور پر جعدہ کے بیان میں لکھا ہے کہ یونانی میں اسے قولیون اور بربری میں ارطالس کہتے ہیں۔ جنطیانا کے بارے میں لکھتا ہے کہ فارسی میں کوشد اور عجمی میں بشلشکہ کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام یونانی ہے جو یونان کے ایک بادشاہ جنطیان کے نام سے ماخوذ ہے۔ جوز کا یونانی نام کاسیاس ہے اور مصر میں اسے اشوبکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زعفران کے متعلق لکھتا ہے کہ اسے سریانی

میں کرکم اور فارسی میں کرکماس کہتے ہیں۔ جساد، جادی، رعبل اور دلہقان بھی اس کے نام ہیں۔ بھنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ فارسی میں شہدانج، عربی میں قنب، رومی میں زکزہ اور مصر میں اسے شرانق کہتے ہیں۔

اسامی ادویہ پر عرب اطباء نے علیحدہ سے کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ صدقۃ السامری (وفات ۱۲۲۳ اور ۱۲۳۲ء کے درمیان) کا رسالہ اسامی الادویۃ المفردۃ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لغات ادویہ پر کتابوں کا یہ دستور عربی دنیا میں آج بھی جاری ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر احمد عیسیٰ نے "معجم اسماء النباتات فی السنۃ لاطینی، فرانسیسی، انجلیزی و عربی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان زبانوں میں ادویہ کے مترادفات درج کیے ہیں۔ کتاب المذکر اللغویہ فی ترجمۃ اہم مفردات الممالک الطبعیۃ باللغۃ العربیۃ والفرانسویۃ والانجلیزیۃ" بھی اس سلسلہ کی ایک اچھی کتاب ہے۔

ادویہ کے علاوہ عام طبی لغت کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب عربی کے مقابلہ میں بالخصوص فارسی نے علمی قدر و منزلت کا درجہ اختیار کیا۔ چنانچہ فارسی میں طبی کتابوں کے ترجمہ اور مستقل تصنیف و تالیف کے بعد طبی لغت کی تدوین پر طبی مصنفین نے اپنی توجہات مرکوز کیں۔ اس سلسلے میں جو لغات ہمارے درمیان ہیں ان میں محمد بن یوسف ہروی کے ہاتھوں لکھی جانے والی بحر الجواہر بہت اہم ہے۔ نامور ہندی مصنف اکبر ارزانی کی کتاب حدود الامراض بھی ایک یادگار کتاب ہے۔

اردو میں لکھی جانے والی طبی لغات میں لغات قطبی (ادارۂ نامی پریس لکھنؤ) لغات کبیر، (ادارۂ المسیح دہلی) مخزن الجواہر حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی کا نام لینا ضروری ہے۔ ان مخصوص فنی لغات کے علاوہ لغت کی عام کتابوں میں طبی الفاظ کا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے جس سے صرف نظر ممکن نہیں۔

عربی، فارسی اور اردو کے ان ماہرین لغت کی کوششیں بے حد قابل تحسین ہیں۔ ان کے قدر و اعتراف میں ذرا بھی کمی علمی احسان فراموشی کے مترادف ہوگی۔ بلاشبہ ان کے ذریعہ مختلف زمانوں میں طبی لغت کے سلسلہ کی ضرورتیں پوری ہوئیں۔ لیکن

گزشتہ صدی میں جو بیشمار طبی معلومات حاصل ہوئیں، طب کے ذخیرہ میں اصطلاحات کا جو ڈھیر اضافہ ہوا اور مختلف علمی زبانوں کے الفاظ نے بین الاقوامی سطح پر جس طرح طبی علوم میں جگہ پائی، اس کا احاطہ یہ کتابیں نہیں کرتی ہیں۔ ایک ایسی جامع اور حاوی لغت کی شدید ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی، جو قدیم طبی الفاظ کے ساتھ ان تمام جدید اصطلاحات پر مبنی ہو، جو نئے طبی اکتشافات کے نتیجہ میں وضع کی گئی ہیں۔ عربی و فارسی میں جو آج بھی متعلقہ ممالک میں زندہ زبان کی حیثیت رکھتی ہیں، نئے انداز پر طبی لغات مرتب کی گئی ہیں۔ لیکن اردو میں ابھی تک ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جاسکا تھا۔ یہ کام اداروں سے تعلق رکھتا ہے کسی ایک فرد سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ایک فاضل طبیب کی برسوں کی لگاتار محنت اور کاوش کا یہ اعجاز ہے، جس نے ایک دانش گاہ کے پروقار علمی ماحول میں ہنگامہ شام و سحر سے بے نیاز، دن کے اجالے اور رات کے سناٹے میں اپنے کام کو جاری رکھا۔ نہ سردی کی شدت اس کے کام میں حارج ہوئی اور نہ گرم ہوا کے جھونکے اور طوفان بادوباراں اس نحیف لیکن علمی خدمت کے جذبہ سے معمور انسان کے حوصلہ و عزم پر اثرانداز ہوئے۔ حکیم عزیز الرحمٰن، استاد جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کی یہ لغت ایک مستقل تالیف ہے۔ اکتالیس ہزار سے زیادہ الفاظ پر مشتمل اس لغت کی تدوین میں جہاں انہوں نے بہت سے الفاظ کی توضیح اور ترجمہ میں فنی قابلیت اور دانشوری کا ثبوت دیا ہے، وہاں عہد حاضر کی انگریزی اور عربی کی تمام معروف طبی لغات سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ مخصوص طور پر جو کتابیں ان کے پیش نظر رہی ہیں ان میں معجم اللسان العربی، بحر الجواہر، مخزن الجواہر، معجم طبی، ٹھرس میڈیل ڈکشنری، حتی ڈکشنری، انٹرنیشنل ڈکشنری، آکسفورڈ میڈیکل ڈکشنری، ڈارلینڈ، بلیک اسٹون میڈیکل ڈکشنری، بلیک اسٹیڈ مین میڈیکل ڈکشنری وغیرہ ہیں، جن سے اس کی قدر و قیمت کا تعین آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس مہتم بالشان کام کے لیے وہ پوری طبی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ طب کے علمی ذخیرہ میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے جو ان کے ذریعہ انجام پایا ہے۔ اس

انگریزی اردو طبی لغت کے علاوہ انہوں نے اردو انگریزی طبی لغت بھی تیار کی ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ ہیں۔ منیر بعلبکی کی مشہور لغت المورد (انگریزی عربی) کے ترجمہ کے فرائض بھی وہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ لغت غیر طبی الفاظ پر مشتمل ہے۔

۱۹۷۳ء میں ان کی ایک کتاب امراض صدر طبع ہوئی ہے یہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان کی دوسری زیر قلم یا زیر تکمیل کتابوں میں قرابادین علوی خاں حصہ امراض راس کا ترجمہ، امراض استحالہ غذا، ذیابیطس پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ، کتاب الرحمۃ سیوطی کا ترجمہ، سوانح عمری حضرت ابوہریرہؓ، بطل السندھ سوانح محمد بن قاسم، "خاتم النبیین" انور شاہ کشمیری کی فارسی تصنیف کا ترجمہ، شاداب افریقہ ناصر عبودی شیخ الجامعہ ریاض یونیورسٹی کے عربی سفر نامہ کا ترجمہ، اسلام کیا ہے محمود شلتوت شیخ الازہر کی کتاب الاسلام کا ترجمہ ہیں جو ان کے طبی و علمی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۷۷ء

○○

تقدمہ مختصر طبی لغت

مختلف زبانوں میں سرمایہ فن محفوظ ہونے کی وجہ سے طب یونانی میں تراجم کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی۔ افریقی، یونانی، رومی، سریانی، عربی، بربری، فارسی میں ان زبانوں کے ماہرین نے جو گراں قدر کتابیں تصنیف کیں، ان کی دوسری زبانوں میں منتقلی کا سلسلہ قائم رہا۔ جن الفاظ کے مترادفات پہلے سے موجود تھے انہیں ترجمہ کی صورت میں منتقل کیا گیا، لیکن جن اصطلاحات کے ہم معنی نام نہیں مل سکے، انہیں دوسری زبانوں میں منتقلی کے دوران اصل شکل میں باقی رکھا گیا۔ طب یونانی کے ذخیرہ میں آج تک یونانی، سریانی، فارسی اور ہندی کے ایسے الفاظ کافی تعداد میں موجود ہیں جو اپنی اصل کی یاد دلاتے ہیں۔ اور یہ اس کا اظہار ہیں کہ ان کے ہم معنی نام عربی میں نہیں پائے جاتے تھے۔

نہ صرف ترجمے کی خاطر بلکہ بنیادی مآخذ تک پہنچنے کے لیے مختلف لغات سے واقفیت ضروری سمجھی گئی۔ اسمائے ادویہ اور اسمائے امراض پر رسالے پہلے سپرد قلم کیے گئے۔ بعد میں دوسری فنی اصطلاحات اور عام طبی الفاظ پر مشتمل لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ عمومی لغت کی کتابوں میں بھی طبی الفاظ کو شامل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی کی ایسی کوئی بڑی لغت نہیں ہے جس میں طبی الفاظ کا ذخیرہ نہ فراہم کیا گیا ہو۔ انگریزی سے اردو یا اردو سے انگریزی لغات میں بھی طبی الفاظ کو جگہ دی گئی ہے۔ طبیبوں نے انگریزی اصطلاحات کے اردو ترجمے پر بھی کافی کام کیا ہے۔ حکیم غلام جیلانی کی مخزن الجواہر اس سلسلے کی پہلی بڑی کوشش ہے۔ لیکن وہ اب نایاب ہے۔ اس کے علاوہ میڈیکل سائنس نے اس کے بعد جس قدر ترقی کی ہے اور نئے نئے الفاظ

مطبوعہ پربھات پرنٹنگ پریس پونہ، ۲۰۰۰ء

سے طب کا دامن جس قدر وسیع ہوا ہے، اس کا احاطہ موجودہ لغات کی کتابیں نہیں کرتی ہیں۔ انگریزی کتابوں کے مطالعے یا ان کے ترجمے کے دوران اردو اصطلاحات کی تلاش ایک مشکل مسئلہ ہوتی ہے۔

کسی بھی فن کی اصطلاحات کے ترجمے کے لیے محض زبان کی صلاحیت کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے اس فن میں مہارت بھی بہت ضروری ہے۔ کسی لفظ کی روح اور اس میں جو ایک جہان معنی آباد ہے، اسے عرفان فن کے بغیر دوسری زبان میں خالی لفظی ترجمے کے ذریعے منتقل کرنے میں بڑی فاش غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے قبل ایک بڑے ادارے کی طرف سے ایک طبی لغت کے مسودے کے چند اوراق میرے پاس بغرض تبصرہ آئے تھے۔ ان میں انگریزی اصطلاحات کا جو اردو ترجمہ پیش کیا گیا تھا، وہ زبان کے لحاظ سے درست تھا لیکن اس سے طبی مفہوم ادا نہیں ہوتا تھا۔ ایسا ناقص اور نادرست ترجمہ فنی لحاظ سے مفید نہیں ہو سکتا۔ انگریزی الفاظ کی متبادل اصطلاحات کے لیے لغوی ترجمہ کافی نہیں ہے۔ اس سے صحیح و مناسب مفہوم کی وضاحت ہونی چاہیے۔ Schizophrenic کا ترجمہ "احمق، نادان، رعونت زدہ" کیا گیا تھا جب کہ مرض Schizophrenia میں مبتلا مریض کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح متروک الفاظ (Obsolete Terms) کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ مثلاً اس میں Slibium اثمد، (سرمہ) کے لیے لکھا گیا تھا جب کہ یہ Antimony کی پرانی اصطلاح ہے جو اب مستعمل نہیں ہے۔ اسی طرح بعض اصطلاحات کے کئی کئی تراجم سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے موزوں لفظ کا انتخاب فنی دانشوری کے بغیر ممکن نہیں ہوتا ہے۔

دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کے دو اصول رہے ہیں۔ ایک تعریب، یعنی غیر زبان کے لفظ میں تصرف کر کے اسے عربی قالب میں ڈھالنا، دوسرے دخیل یعنی تغیر و تبدل کے بغیر اس لفظ کو جوں کا توں اختیار کرنا۔ طب یونانی کی بنیادی زبان عربی ہے۔ فارسی اور اردو کی طبی کتابوں میں عربی اصطلاحات کو آزادانہ طور پر استعمال

کیا گیا ہے۔ گزشتہ صدی میں انگریزی کے جو الفاظ عربی میں منتقل ہوئے انہیں طب یونانی کی اردو کتابوں میں بطور اصطلاح شامل کیا گیا، انگریزی کی نئی اصطلاحات کے لیے بھی اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ وضع اصطلاحات میں اگر اس مقررہ راہ کو ترک کیا گیا اور طب میں پہلے سے چلے آرہے عادی اور متداول الفاظ کی رعایت نہیں رکھی گئی تو اس میں قائم یکسانیت اور یک رنگی ختم ہو جائے گی۔ اردو میں بے شمار انگریزی اصطلاحات منتقل ہو چکی ہیں، ان سے اب تک جس شکل میں فائدہ اٹھایا گیا ہے، اسی طرح مناسب ترمیم کے ساتھ جدید ترین الفاظ کے ذیل میں اٹھانا چاہئے۔ عربی میں جو جامعیت، وسعت اور الفاظ کو ڈھالنے اور تراشنے کی صلاحیت ہے، اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ایلوپیتھی کے نئے الفاظ کا عربی جامہ طب یونانی کی زبان اور اس کے مزاج و آہنگ کے مطابق ہوگا۔ عربی کے بعض الفاظ بظاہر ثقیل اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، لیکن ظاہر ہے علمی اصطلاحات عوام کے لیے نہیں وضع کی جاتیں، ان کا تعلق خواص اور اہل علم سے ہوتا ہے۔ ایک عام پڑھے لکھے شخص کے مقابلے میں الفاظ کے ثقیل اور غیر ثقیل ہونے کا فیصلہ صاحب فن ہی کر سکتا ہے۔ اس کی پرکھ کے لیے دوسرے کی رائے بہت موزوں اور وقیع نہیں ہو سکتی ہے۔

تدوین لغت اور اصطلاح سازی کا مسئلہ بڑا مشکل اور دقت طلب ہے۔ کسی ایک شخص کے لیے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ یہ ایک اجتماعی کام ہے۔ اس کے واسطے اہل علم کی ایک جماعت کی تشکیل ضروری ہے۔ دونوں زبانوں پر قدرت اور فن سے پوری واقفیت کے بغیر اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ طب کے ہر مضمون کی اصطلاح کے لیے اس خاص مضمون میں ماہرانہ بصیرت درکار ہے۔ طب کے سارے مضامین کی اصطلاح پر تنہا ایک آدمی کا کام ناقص اور غیر مستند رہے گا۔ یہ بڑی پتہ ماری اور کئی لوگوں کے مل کر انجام دینے اور ایک مجلس کے کرنے کا کام ہے۔

طبی علوم میں لگاتار اضافہ اور بہت سی جدید اصطلاحات سامنے آنے کی وجہ سے

ایک جامع طبی لغت کی شدید کمی عرصے سے محسوس کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر محمد غفران نے بڑے ذوق اور حوصلے سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایلوپیتھی کے آدمی ہیں۔ لفٹنٹ کرنل کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد یونانی میڈیکل کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دوران درس انہیں انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے لغت اور طب کی کتابوں کی ورق گردانی کے صبر آزما اور وقت طلب کام کے بعد ایک بڑا ذخیرۂ الفاظ جمع کیا۔ انہوں نے الفاظ کے صحیح استعمال کے لئے اپنی حد تک بڑی محنت و کاوش کی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مثلاً اینمیا کے لئے قلت الدم، فقر الدم اور نقص الدم کی جو یکساں اصطلاحیں مستعمل ہیں ان میں غیر طبی حلقہ کے لئے قلت الدم مفید اصطلاح ہے، مگر طبی طور پر یہ اصطلاح اینمیا کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی ہے۔ انہوں نے اس کیلئے فقر الدم کا استعمال کیا ہے اور قلت الدم کے لئے Ischaemia کو ترجیح دی ہے۔ کثرت الدم کی اصطلاح Hyperaemia اور Congestion دونوں کے واسطے مستعمل ہے مگر یہ دونوں اصطلاحیں دو مختلف حقائق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ انہوں نے کثرت الدم کے لئے Hyperaemia کا انتخاب کیا ہے۔ اس سے Congestion کو Passive Hyperaemia سمجھتے ہوئے غیر فاعلی کثرت الدم کہنا ممکن ہو گیا ہے۔ بعض مروجہ اصطلاحات موجودہ علم کی روشنی میں حقیقت کے خلاف ہو چکی ہیں اور ترمیم طلب ہیں۔ خون کے سرخ ذرات کو کرویات حمرا کہنا اس وقت صحیح تھا جب ان کی غیر کروی ساخت سے ہم کماحقہ واقف نہیں تھے۔ سرخ ذرات کو کرویات حمرا کہنے کے بعد Spherocytosis کی تعریف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ Spherocytosis کی تعریف ان الفاظ میں کرنی پڑے گی "کرویات حمرا میں کروی تبدیلی Spherocytosis کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے کروی اجسام میں کروی تبدیلی کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر غفران نے کرویات چھوڑ کر عمومی لفظ خلیات استعمال کیا ہے۔ Angina Pectorals کا ترجمہ ذبحہ صدریہ اور وجع القلب کیا جاتا ہے۔

Angina کے مفہوم میں درد کے ساتھ دباؤ کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس میں مریض کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہے۔ یہ مفہوم ذبحہ سے ادا ہوتا ہے وجع سے ظاہر نہیں ہوتا۔ مگر زیادہ تر لوگ وجع القلب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور انگریزی لفظ Pectoris (صدر) سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد غفران اور بعض دیگر حضرات کی یہ رائے کافی باوزن ہے کہ عربی میں بعض انگریزی حروف کا تلفظ ادا نہیں ہو سکتا مثلاً D(ڈ) G(گ) T(ٹ) Ch(چ) Gh(گھ) Th(ٹھ) جب کہ اردو میں یہ مجبوری نہیں ہے۔ لہذا عربی کی نقل میں پولپ کو بولب، ڈائی فرام کو دیافراغمہ، گنگرین کو غانغرانا، انفلوئنزا کو انف العنزا کیوں کہا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے دیافراغمہ، غانغرلنہ اور دوسرے معرب الفاظ عرصے سے اردو میں مستعمل ہونے کی وجہ سے اتنے عام ہو گئے ہیں اور زبانوں پر اس قدر چڑھ گئے ہیں کہ انہیں ترک کر کے نئے الفاظ تراشنا اصطلاحات کے پورے نظام کو بدلنے کے مترادف ہو گا۔ اس رائے کے بارے میں آئندہ کیلئے ضرور غور کی ضرورت ہے کہ جن نئی انگریزی اصطلاحات کا مناسب بدل نہ ملے انہیں معرب کر کے اردو میں استعمال کرنے سے بہتر ہے کہ انہیں براہ راست انگریزی سے لیا جائے۔ یوں بھی اس دو سو برس کے عرصے میں اردو زبان نے اس قدر ترقی حاصل کر لی ہے کہ وہ بلاواسطہ انگریزی سے استفادہ کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر غفران نے انگریزی الفاظ کے اردو ترجمے کے لئے عربی کے بجائے فارسی تراکیب کو ترجیح دی ہے۔ لیکن اس سے اصطلاحات کی یکسانیت متاثر ہونے کا پورا احتمال ہے۔ عربی سے سرمایۂ فن فارسی اور اردو میں منتقل ہونے کی وجہ سے طب کی بیشتر اصطلاحات عربی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ ایرانی مصنفین کے اثر یا نئی اصطلاحوں کے لئے متبادل عربی الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے فارسی اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں لیکن وہ عربی کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

آخر میں ایک جامع انگریزی اور طبی لغت کی تدوین کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ عربی میں جو جدید طبی لغات مرتب کی گئی ہیں وہ ہمارے لئے خاص اہمیت کی حامل ہیں ان سے استفادے کے ذریعے مصطلحات کے سلسلے میں ایک عالمی معیار متعین ہوگا۔

۲۔ طب یونانی میں پہلے سے عربی اصطلاحات رائج ہیں۔ نئے انگریزی الفاظ کے عربی مترادفات قدیم ذخیرہ سے بے جوڑ اور بے میل نہیں معلوم ہوں گے اور اس سے طبی زبان میں یکسانیت قائم رکھنے میں مدد ملے گی۔

۳۔ عربی میں جو جامعیت اور اشتقاق کی جو صلاحیت ہے اس کی وجہ سے الفاظ کی تراش خراش آسان ہوگی۔

۴۔ یہ انفرادی کام نہیں ہے۔ اسے اجتماعی طور پر انجام دینا چاہئے۔ ایک ایسا بورڈ بنایا جائے جس میں یونانی اور ایلوپیتھی کے ماہرین کے ساتھ انگریزی داں اور عربی داں افراد شامل ہوں۔ جن لوگوں نے اپنے طور پر اس قسم کی کوششیں کی ہیں انہیں اس بورڈ میں شریک کیا جائے اور ان کے انجام دیئے گئے کام سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۵۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن ملک کے ایسے اعلا ترین ادارے ہیں جن کے ذرائع و وسائل کافی وسیع ہیں۔ اس منصوبے کی انجام دہی کے لئے ان سے زیادہ موزوں دوسرا ادارہ نہیں ہو سکتا وہ اگر اس کا اہتمام کریں تو یہ اس کی بہتر تکمیل کا ضامن ہوگا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مختلف مضامین کی فرہنگ و اصطلاحات پر کام کر رہی ہے اور وہ اپنا دائرہ آسانی سے طب کی اصطلاحات تک وسیع کر سکتی ہے۔ اس کے زیر اہتمام طبی اصطلاحات کا یکساں معیار قائم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ انگریزی کی کسی اصطلاح کے مختلف اردو ترجموں کے استعمال سے مطالعے اور تصنیف و تالیف میں دشواری ہوتی ہے۔

۲۲/اپریل ۱۹۹۹ء

OO

تقدمہ رسائل مسیح الملک

ہندوستان میں جن طبیبوں نے حذاقت اور شعور فن کے ساتھ علمی و تصنیفی امتیاز حاصل کیا ہے ان میں بہت ممتاز مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی ذات گرامی ہے۔ ان کی سحر انگیز شخصیت، طبی قامت، علاجی کمالات، قومی و سیاسی تحریکوں اور تعلیمی و ملی مسائل میں ان کی شاندار خدمات کا عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی تصنیفی حیثیت اور طب میں ان کی اجتہادی شان کا زیادہ ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ حکیم اجمل خاں کا محض ایک حاذق معالج اور قومی و سیاسی رہنما کی حیثیت سے تعارف ان کی شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہے وہ طب کے ایک ایسے عالم تھے جنہوں نے مختلف طبی موضوعات پر آزادانہ قلم اٹھایا ہے اور جن کے پیش نظر قدیم مباحث کی تنقیح و تہذیب رہی ہے۔ ان کی تحریروں میں تشریح طلب طبی مسائل کو جدید افکار و خیالات کی روشنی میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہی نہیں ملتی، ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طب کی شناخت اور اس کی بنیادی قدروں کا ان کے یہاں پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

حکیم اجمل خاں کی فنی تعلیم و تربیت میں ان کے والد حکیم محمود خاں اور بڑے بھائی حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۲ء تک تقریباً ۹ سال ریاست رامپور میں طبیب خاص کی حیثیت سے ان کا قیام رہا۔ دہلی میں اگرچہ انہوں نے عربی زبان و ادب کی تحصیل کی تھی مگر رام پور میں اس زمانہ میں محمد طیب مکی جیسا عربی زبان کا ادیب شہیر موجود تھا۔ ان سے انہوں نے عربی تحریر و تقریر میں ملکہ حاصل کیا۔ عربی ادب میں ان کے کمال اور سلیس و شگفتہ گفتگو کا عرب ممالک کے سفر کے دوران عراق اور مصر کے علماء نے اعتراف کیا تھا۔ شفاء الملک حکیم

مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

محمد حسن قرشی کے بقول مولانا شبلی کا کہنا تھا کہ "میری نظر میں ہندوستان بھر میں حکیم اجمل خاں سے زیادہ کوئی شخص قابل عزت نہیں ہے کیونکہ علم وامارت کا ان سے بہتر پیکر ملنا مشکل ہے۔"

مفتی کفایت اللہ کا بیان ہے کہ "انہیں عربی میں اس قدر کمال تھا کہ بلا تکلف عربی بولتے تھے اور عربی نظم و نثر لکھتے تھے۔ عربی جاننے والوں سے وہ عربی میں مکاتبت و مراسلت کرتے تھے۔ میری خط وکتابت ان سے عربی میں ہوتی تھی۔ اگر اتفاق سے میں نے کبھی اردو میں کوئی خط بھیج دیا تو جواب عربی میں دیتے تھے اور اردو میں خط لکھنے کی شکایت کرتے تھے۔" ان کا بیان ہے کہ حکیم صاحب کے عربی خطوط کا کافی ذخیرہ ان کے پاس تھا۔

حکیم نذر احمد کے مطابق علی گڑھ کے عربی کے جرمن پروفیسر ٹ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہندوستان میں عربی ادب کے ماہر صرف دو شخص ہیں ایک مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور دوسرے کلکتہ کے ایک صاحب۔

عربی اشعار بھی کہتے تھے۔ ان کا عربی کا غیر مطبوعہ کلام موجود تھا۔ رموز الاطباء میں بعض عربی اشعار شائع ہوئے ہیں۔ عربی ادب کے علاوہ رام پور میں انہیں فارسی میں بھی مہارت کا موقع ملا۔ ریاست کے اساتذہ باکمال کی صحبتیں انہیں میسر آئیں اس سے نہ صرف ادب اور تصنیف و تالیف بلکہ شعر و سخن کا بھی ذوق پیدا ہوا اور تینوں زبانوں میں انہوں نے طبع آزمائی کی۔

عربی زبان سے یہ ان کے ذوق ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی بیشتر تحریریں عربی میں محفوظ ہیں۔ یہ تحریریں ابتدائی عمر سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعد میں مطب اور سیاسی مشغولیات کے باعث وہ علمی کاموں کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکے تھے۔

۱۔ القول المرغوب فی الماء المشروب

۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء میں زمانہ طالب علمی میں لکھا گیا ان کے مضامین میں یہ غالباً پہلا مضمون ہے جو کلیات قانون کی سولہویں فصل، احوال المیاہ، میں مذکور قول شیخ کی شرح میں ہے اور جس میں پانی کے جزء بدن ہونے یا نہ ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ "الساعاتیہ" کے ساتھ افضل المطابع دہلی سے ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں طبع ہوا ہے۔ کسی قدر تصرف کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ انہوں نے "مجلہ طبیہ دہلی" میں شائع کرایا تھا جو مجلہ کے کئی شماروں میں قسط وار طبع ہوا ہے۔ استاد محترم شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی مرحوم نے ۱۹۲۶ء میں اس کے جواب میں ایک رسالہ "التحقیق المطلوب فی الماء المشروب" لکھا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔

۲۔ التحفۃ الحامدیۃ فی الصناعۃ التکلیسیۃ

اس میں کشتہ جات کے استعمال کے جواز اور ان کے فوائد پر دلنشین انداز میں لکھا ہے اور ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو کشتوں کے استعمال پر بالخصوص لکھنؤ اسکول کی جانب سے کئے گئے تھے۔

۳۔ البیان الحسن بشرح المعجون المسمی باکسیر البدن

اس میں اپنے جدامجد حکیم شریف خاں کی کتاب "علاج الامراض" کے مشہور مرکب معجون لنا کے معمہ کو حل کیا ہے۔ اس کا ایک حصہ فارسی میں ہے۔ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء کی افضل المطابع دہلی کی اشاعت میرے پیش نظر ہے۔

۴۔ اوراق مزھرۃ مثمرۃ مسفرۃ

یہ رسالہ چند طبی استفسارات مثلاً سبب و علاج طاعون، زمانہ حمل میں مدرات،

ورم طحال میں مسہلات اور سعال میں حموضات کے استعمال اور مبحث رتق کے بارے میں جوابات پر مشتمل ہے۔ جی اینڈ سنس پریس دہلی سے بغیر سنہ طبع ہوا ہے۔

۵۔ الساعاتیۃ

طبی کتب میں ذائقوں میں حلاوت کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے ایک گھنٹہ میں تحریر کیا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ اس کی تالیف کے وقت ان کے پیش نظر کوئی کتاب نہیں تھی۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء کی یہ تالیف القول المرغوب کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس اشاعت میں درج بالا رسائل اور رسالہ طاعون کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب رسالے ۱۹۰۴ء سے قبل طبع ہو چکے تھے۔

۶۔ الوجیزۃ

اس رسالہ میں کلیات قانون ابن سینا میں بیان کردہ نبض مستوی و نبض مختلف کی شرح کی گئی ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حکیم محمد جمیل خاں اور دوسرے تلامذہ کے درس کے دوران تحریر کیا ہے۔ میرے پیش نظر اس کی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء کی اشاعت ہے۔

۷۔ مقدمۃ اللغات الطبیۃ

ان کی کتاب لغات طبیہ اگرچہ طبع نہیں ہوئی لیکن اس کا مقدمہ جو تقریباً ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۱۵ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا ہے۔ اس میں لغت نویسی کے بارے میں بڑی بیش قدر معلومات مثلاً شواذ، معرب، دخیل، مولد، اشتقاق کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ طب میں الفاظ کن صورتوں اور کن اوزان میں استعمال ہوئے ہیں۔

۸۔ المسائل الخمسہ

حکیم صاحب نے طب کے پانچ مسائل تعیین ایام بحران، عفونت خلط صفراء، خلط صفراء کے تلخ ذائقہ، داخل عروق اخلاط کے تعفن، اور غذا، مطلق کے وجود کے بارے میں جمہور اطباء سے اختلاف کیا اور ان امور کے متعلق قدیم و مسلمہ نظریات کی تردید کی۔ ان کی یہ اختلافی تحریر کسی علاحدہ رسالہ کے بجائے حکیم فیروز الدین کی کتاب رموز الاطباء میں شائع ہوئی ہے۔ ان کی دوسری تالیفات کے مقابلہ میں طب کے علمی حلقہ میں اس پر زبردست رد عمل ہوا اور اس کی تائید و تردید میں رسائل کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ طب کے مناظرانہ ذخیرہ میں یہ رسائل اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے اس دور کے علمی مزاج کا اظہار ہوتا ہے۔ ان مسائل خمسہ کی تنقید میں حکیم حافظ عبدالمجید لکھنوی نے ۱۹۱۲ء میں ابانۃ الحجۃ لمن سلک الطریقۃ المعوجہ لکھا۔ حکیم محمد عبداللہ رام پوری نے ۱۹۱۳ء میں تقویم الاود اور حکیم ایوب اسرائیلی نے اقوم الدلائل علی خمسۃ مسائل فاضل لکھنوی کے جواب میں شائع کیں۔ حکیم عبداللہ نگینوی اور حکیم فرید احمد عباسی نے اجمل خاں کی تائید میں مضامین لکھے۔

اجمل خاں کے یہ رسالے سلیس عربی میں ہیں اور شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی کے الفاظ میں "ان میں سلاست بیان، حریت رائے، اصابت فکر اور وسعت نظر کی وہ تمام خصوصیات جمع ہیں جو ایک بہترین مصنف کا حصہ ہو سکتی ہیں۔"

القول المرغوب کے علاوہ جو ان کی طالبعلمی کی یادگار ہے، باقی تصانیف زمانہ قیام رام پور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تذکرہ مسیح الملک میں اوراق مزہرہ کو جگہ جگہ جہاں اوراق مظہرہ لکھا ہے وہاں ایقاظ الغسان فی اغالیط غایۃ الاستحسان کو ان کی تصانیف میں شمار کر لیا ہے، جبکہ یہ رسالہ ان کے شاگرد حکیم شفیق الرحمان رام پوری کا تصنیف کردہ ہے۔ اور شفیق الرحمٰن ہی کے نام سے افضل المطابع دہلی سے ۱۹۰۶ء میں چھپا ہے۔ رسالہ کے آخر میں محمد طیب مکی کی تقریظ شامل ہے جس میں شفیق الرحمان کی علمی

حیثیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

۹۔ رسالہ طاعون

۱۸۹۵ء میں ملک میں طاعون کی وبا اس طرح پھیلی کہ ہزاروں جانیں اس کی نذر ہوئیں۔ انہوں نے عام لوگوں کی معلومات اور استفادہ کے لئے طاعون پر اردو میں یہ رسالہ تصنیف کیا۔ اس میں تاریخی پس منظر کے ساتھ اسباب و علامات اور علاج پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ معالجات کے ذیل میں خاندانی معمولات بھی درج کئے ہیں یہ رسالہ متعدد بار طبع ہوا ہے۔

۱۰۔ حاذق

ان کی علمی یادگاروں میں ایک قابل قدر تصنیف "حاذق" ہے یہ اردو میں معالجات کی ایسی مختصر اور مفید کتاب ہے جس سے ان کے انداز مطب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور طالبان فن کو مطب کے رموز اور کامیاب معالجہ سے عہدہ برآ ہونے کے نکتے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۱۔ افادات مسیح الملک

ان کے شاگرد حکیم نذر احمد خاں نے ان کے علاجی واقعات اور کلینکی مشاہدات کو افادات مسیح الملک کے نام سے شائع کیا ہے۔ سریریات اور قصص و حکایات مرضیٰ کے سلسلہ کی اردو میں یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ اس میں مریض کی ہسٹری، تشخیص و تجویز اور علاجی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔

۱۲۔ مجلّہ طبیہ

دہلی سے یہ رسالہ انکی زیر نگرانی شائع ہوتا تھا۔ اس میں ان کے بعض مضامین طبع ہوئے ہیں۔ پیر جی حکیم عبدالرزاق اس کے ادارتی فرائض انجام دیتے تھے۔ یکم اپریل

۱۹۰۳ء سے اس کا اجراء عمل میں آیا تھا۔

ان کی چار کتابیں "رسالہ فی ترکیب الادویہ واستخراج در جاتہا" "المحاکمۃ بین القرشی والعلامہ" "حاشیہ شرح اسباب" اور "اللغات الطبیہ" زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔

رامپور میں انہیں ریاست کے کتب خانہ کی نگرانی بھی تفویض تھی۔ انہوں نے جہاں قلمی کتابوں کی فہرست و ترتیب کا کام انجام دیا وہاں نوادرات کے مطالعہ پر پورا وقت صرف کیا۔ کتب خانہ رام پور کے طبی مخطوطات پر ان کے قلم سے حواشی اور علمی یادداشتیں تحریر ہیں ان کے یہ حواشی جو رضا لائبریری کے علاوہ خاندانی ذخیرہ اور طبیہ کالج قرول باغ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، اگر مرتب کئے جائیں تو اس سے ان کے علمی کاموں کا مزید تعارف ہوگا۔

حکیم اجمل خاں کے عربی رسالے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ان کی ابتدائی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ان کے تنقیدی شعور کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان پر قدیم طبی کتب کا کافی غلبہ تھا اور شروح قانون کے فلسفیانہ مباحث ان کے ذہن میں تازہ تھے۔ نصابی کتابوں کے مرتب کردہ اثرات ان تحریروں میں پوری طرح دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن بکثرت طبی تجارب اور علم نیز جدید تحقیقات سے آگاہی کی وجہ سے ان کے یہاں جو جودت اور ذکاوت پیدا ہوئی تھی، وہ ان کے ان افادات میں نمایاں ہے، جنہیں ان کے بعض شاگردوں نے مرتب کیا ہے۔ ان میں بہت سے مقامات پر مختلف فیہ مسائل کے بارے میں انہوں نے اپنی مجتہدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ کتاب قانون عصری کو ان کی ذہنی و علمی کاوشوں کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ادویہ پر تحقیق اور ریسرچ اور اصلاح و تجدید فن کے سلسلہ میں ان کی کوششوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

انہوں نے طب کے قدیم نظام تعلیم میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ایک نیا نصاب مرتب کیا۔ جس کے مطابق نئے انداز پر کتابوں کی تدوین کی گئی۔

طب کا موجودہ نصاب کم و بیش انہیں خطوط پر مرتب ہے جنہیں مسیح الملک نے قائم کیا تھا۔

حکیم اجمل خاں کے عربی رسائل کے مطالعہ اور استفادہ سے اطباء کا عام اردو خواں طبقہ محروم تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نوجوان فارغ عزیزی حکیم رضی الاسلام ندوی نے بڑے شوق اور دلچسپی سے ان رسائل کا "رسائل مسیح الملک" کے نام سے سلیس اردو ترجمہ کیا ہے۔ "اجملیات" کے مطالعہ میں ان کا یہ کام خصوصی اہمیت کا حامل قرار پائے گا اور طب کے علمی حلقہ میں اس کی پذیرائی کی جائے گی۔ رضی الاسلام ندوی کی عربی لیاقت اور علمی و فنی شغف کے پیش نظر امید ہے کہ وہ عربی کی مزید اہم طبی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے پر اپنی صلاحیت صرف کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی عمر اور علم میں برکت عطا فرمائے۔

۲۸ر فروری ۱۹۹۱ء

OO

تقدمہ اختیارات قاسمی

"اختیارات قاسمی" کے نام سے طبی مضامین کا یہ مجموعہ تاریخ طب، علم الادویہ اور معالجات کے بعض اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان میں عربی دور ترجمہ کی یادگار حنین ابن اسحٰق اور تخلیقی عہد کے ترجمان محمد بن زکریا رازی اور ابن سینا کے علاوہ ہندستان کے نامور طبی مصنف حکیم محمد اعظم خاں شامل ہیں۔ یہ نہ صرف متاخرین اطباء ہند بلکہ برصغیر کی پوری طبی تاریخ میں اپنے تبحر علم، حذاقت فن اور مجتہدانہ کارناموں کی وجہ سے اس قدر یکتا اور گراں مایہ ہیں کہ انہیں عربی وایرانی عہد کے لائق ترین طبیبوں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کی بلند پایہ تصانیف نے ہندستانی مصنفین کا بھرم اور اعتبار قائم کیا ہے۔ حجم و ضخامت کے ساتھ ہی معنویت اور علمی مواد کے لحاظ سے ان میں تحقیق کے بہت سے گوشے اہل علم کی توجہ خاص کے منتظر ہیں۔ ایک مضمون میں سرسید احمد خاں کی طبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسید پر اگرچہ مختلف حیثیتوں سے لکھا گیا ہے لیکن ان کی طبی حیثیت کو عنوان قرار دے کر کچھ لکھنے کی غالباً یہ پہلی کوشش ہے۔ شرق اوسط میں مخصوص موسم اور آب وہوا کی وجہ سے عام وقوع پذیر امراض میں آنکھوں کی بیماریاں ہمیشہ سرفہرست رہی ہیں۔ وہاں ہر دور میں بہترین ماہر امراض چشم پیدا ہوتے رہے۔ آنکھوں کی تشریح، فعلیات، مرضیات اور معالجات پر ان کے تحقیقی کارناموں کا پوری فراخ دلی سے اعتراف کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر جس کثرت سے عرب اطباء نے کام کیا ہے وہ دوسرے نظام ہائے بدن کے امراض کی نسبت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس مجموعہ کے ایک مضمون میں "قرون وسطیٰ کے ماہرین امراض چشم" کا مختصر تعارف پیش کیا گیا

مطبوعہ پانکی پتر لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۸۷ء

ہے۔ مضمون میں اگرچہ بعض نہایت اہم شخصیتیں ذکر سے رہ گئی ہیں لیکن ایک تعارفی خاکہ اور جائزہ کے بطور اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ موضوع دراصل ایک مستقل اور ضخیم کتاب کا متقاضی ہے کسی مختصر مضمون میں اس کا احاطہ آسان نہیں ہے۔

یونانی دواؤں پر کام کے سلسلے میں سب سے پہلا مسئلہ ان کی شناخت سے متعلق ہے۔ قدیم اغریقی اور اس کے بعد عربی و فارسی ناموں کے ہندوستانی مترادفات نے اس مسئلہ کو جس طرح الجھایا، وہاں ملاوٹ اور نقلی دواؤں نے اس پیچیدگی میں مزید اضافہ کیا۔ یہ دونوں اپنی جگہ نہایت تحقیق طلب مسئلے ہیں۔ تاثیرات اور افعال ادویہ پر کئے گئے کسی بھی تحقیقی کام سے قبل دوا کی شناخت بے حد ضروری ہے۔ "یونانی دواؤں میں پیش آمدہ دشواریاں" ایک فکرانگیز مضمون ہے۔ جس میں شناخت کے جدید طریقوں کے مطابق تزئیف (ملاوٹ) اور اصلی و نقلی دوا کے درمیان امتیاز پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اسی طرح دواؤں کے جو خواص و تاثیرات قدیم کتابوں میں مذکور ہیں ان میں سے بعض دواؤں کے بیان کردہ خواص کلینیکی تجربات کی روشنی میں صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ جدید تحقیق کی روشنی میں واقعی افادیت کے تعلق سے مفردات کے از سر نو جائزہ سے زیادہ عرصہ صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

موالید ثلاثہ پر مہر وماہ کا اثر عام انسان کے واضح محسوسات میں سے ہے۔ لیکن دوسرے سیارگان کی حرکت اور گردش کے جو اثرات موجودات عالم پر مرتب ہوتے ہیں، علماء ہیئت و فلکیات نے ان کے مطالعہ کی کوشش کی ہے۔ بابلی عہد میں اس مطالعہ کی نہ صرف ابتدا ہوئی بلکہ اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ پھر یونانیوں اور عربوں نے اس میں مزید وسعت پیدا کی۔ ماہرین علم الادویہ نے بھی نباتی، حیوانی اور معدنی تینوں قسم کی ادویہ پر ان کے طاری ہونے والے اثرات کا گہری توجہ سے مشاہدہ و معائنہ کیا۔ انکے درمیان پائی جانے والی نسبتوں اور رشتوں کی تحقیق کی، اور ان کی روشنی میں ادویہ کی طبعتوں، کیفیتوں اور خاصیتوں کا تعین کیا۔ "موالید ثلاثہ اور ان پر سیارات کے اثرات"

میں اس موضوع پر سیر حاصل انداز میں لکھا گیا ہے۔ علم الادویہ میں جن مختلف دائروں اور سمتوں میں تحقیقی کام کی ضرورت ہے، ان میں یہ بھی ایک اہم موضوع ہے۔ جس پر دوسرے متعلقہ سائنسی مضامین کی روشنی میں تحقیق کی جانی چاہئے۔

"برشعشا" یونانی کا ایک زود اثر مرکب ہے۔ تاریخی پس منظر اور افعال کی تفصیل کے علاوہ ایک مضمون میں اس کے مختلف مصنفین کے مرتب کردہ نسخوں کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

معالجات میں موجودہ زمانے کے عام امراض وجع مفاصل، جذام، یرقان، ضیق النفس، وجع الکلیہ، ذات الجنب، ذات الریہ پر قدیم مصنفین کی کتابوں کے علاوہ جدید معلومات کی روشنی میں اسباب، علامات، تشخیصی نکات اور علاج کی تفصیل کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ اس سے مطب و معالجہ میں پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے مجموعوں میں چونکہ مضامین کا تنوع ہوتا ہے اس لئے قاری کسی ایک موضوع کی طویل اکتا دینے والی کیفیت سے دوچار نہیں ہوتا۔ مجموعے کے مرتب اقبال احمد قاسمی دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے فارغ ہیں۔ بی۔یو۔ایم۔ایم۔ایس کے بعد انہوں نے علی گڑھ ہی سے علم الادویہ میں ایم ڈی کیا ہے۔ ان کا شمار علی گڑھ کے ممتاز طالب علموں میں ہے۔ عربی و فارسی کے ساتھ ان کا طبی مطالعہ وسیع ہے۔ طب کی قدیم عربی کتابوں کے علاوہ انگریزی کی جدید کتابوں سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابل ستائش ہے کہ یہ ایک طبی طالب علم کی بہترین علمی مساعی کا اظہار ہے۔ مجموعہ کے بیشتر مضامین انہوں نے علی گڑھ میں اپنے تحقیقی کام کے دوران لکھے ہیں۔ ایک نوعمر قلم کار کے ان مضامین میں فنی پختگی اور شان تحقیق نظر آتی ہے اور اس سے ان کی فکری بالیدگی اور ذہنی بلوغ کا پتہ چلتا ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ بہ نگاہ قدر و تحسین پڑھا جائے گا۔

۶/دسمبر ۱۹۸۷ء

○○

تقدمہ طب یونانی اور چیلنجز

دوسرے قدیم علوم کی طرح طب یونانی بھی اپنی بقااور تحفظ کے سنگین مسئلے سے دوچار ہے۔ اس کو بچانے اور قوت حیات عطا کرنے کی تدابیر اور جدوجہد کا سلسلہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہندستان میں مغربی علوم اور مغربی طب کی آمد کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں قدیم طبی نظریات کے مطالعہ اوران کے تصادم باہم نے یونانی علماء اور ماہرین کو اپنے فن کے مبادیات پر غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔

ہندستان میں جدید تعلیمی نظام کی ابتدااور سرسید تحریک کے فوراً بعد طب یونانی کے تعلیمی نظام میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس کو عصری تعلیم سے ہم آہنگ کرنے کے اہتمامات کئے گئے۔ اس سے جہاں بعض فنی مسائل کے حل میں مدد ملی، وہاں بہت سی دشواریاں اور الجھنیں بھی پیدا ہو گئیں۔ ان الجھنوں اور پریشانیوں کا نہ صرف نظریات و فلسفہ سے بلکہ نصاب تعلیم، طریقہ تحقیق، تشخیصی ذرائع اور علاج و معالجہ سے گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح نصاب کے بعض مضامین سے لے کر جدید دواؤں تک کا استعمال اس دائرہ میں آتا ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے ان درپیش مسائل کے حل کے لئے نصاب میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کے ساتھ جدید ماہرین طب کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی زندگی میں (۱۹۲۷ء۔ ۱۸۶۴ء) اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ (۱۹۴۷ء) تک جب قدیم اطباء اثرانداز حیثیت میں موجود تھے، بہت سے مسائل ابھر کر سامنے نہیں آئے۔ لیکن بعد میں جب نئے نصاب کے فارغین نے ان قدیم

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۷

اساتذہ کی جگہ لی، تو چونکہ ان کا ذہن خود صاف نہیں تھا، اور مخلوط نصاب نے انہیں پراگندہ خاطری میں مبتلا کیا تھا، اور وہ یقین واعتماد جو کسی فن کے حاملین میں اپنے فن سے وابستہ رہنے کے لئے ضروری ہے، ان کے یہاں بڑی حد تک مفقود تھا، جس کو اور بڑھاوا دینے میں طبی کالجوں میں موجود طب جدید کے اساتذہ نے خاص کردار ادا کیا تھا، تو اس کے اثرات نہ صرف یہ کہ تعلیمی اداروں پر مرتب ہوئے، بلکہ آہستہ آہستہ پورے ملک میں عام ہوگئے۔ اور تعلیم و تحقیق سے آگے بڑھ کر طبی علاج و معالجہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔

طب کا ایک طالب علم جب نصاب میں پڑھائے جانے والے مضامین کی وجہ سے ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی تشفی کا کوئی سامان فراہم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اساتذہ کو ایلوپیتھک طریقہ علاج سے مطب کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور ان میں اسے اپنے فن پر اعتماد اور بھروسے کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے تو خود اسکے اندر شعور اور عرفان فن اور ایقان وادراک کی کیفیت کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے۔

طبیہ کالج علی گڑھ سے فراغت کے بعد میں خود اس پراگندہ ذہنی میں مبتلا رہا اور میں نے طبی مسائل و مشکلات پر طالب علمانہ انداز میں بحد توفیق غور و فکر کیا۔ میرے یہ خیالات "دور جدید اور طب" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ طب کے علمی حلقوں میں اس کی جس طرح پذیرائی ہوئی وہ اس ہیچمداں کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ میرا احساس ہے کہ طب کا ہر وہ طالب علم جو تعلیم سے فراغت کے بعد طب یونانی سے اپنی وابستگی قائم رکھنا چاہتا ہے اور اس فن سے فکری اور عملی رشتہ محسوس کرتا ہے اس کے سامنے یہ سارے مسائل چیلنج بن کر آتے ہیں۔

حکیم اشہر قدیر ایسے ہی ایک نوجوان طبیب ہیں۔ درسیات کی تکمیل کے بعد ان کے ذہن میں بھی یہ سوالات آئے اور انہوں نے اپنی حد تک ان کے جوابات کی تلاش کی۔ انہوں نے مختلف موضوعات مثلاً طب کی تعلیمی زبان، موجودہ نصاب اور طریقہ تعلیم، معیار داخلہ، دوران تدریس عملیات کا فقدان، طبی تحقیق، مطب میں درپیش

مسائل، یونانی طریقہ علاج اور اینٹی بایو ٹکس وغیرہ پر مضامین تحریر کئے۔ یہ مضامین ہمدرد پندرہ روزہ دہلی میں شائع ہوئے۔ بعض مضامین میری نظر سے بھی گزرے۔ انہوں نے بڑی دلچسپی، تعلق اور آزاد ذہن کے ساتھ ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنی بساط بھر مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حکیم اشہر قدیر نے ہمدرد طبی کالج نئی دہلی سے بی۔یو۔ایم۔ایس اور اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کلیات وماہیت الامراض میں ایم ڈی کیا ہے۔ وہ ان دونوں اداروں میں اپنی علمی لیاقت اور شوق علم کی وجہ سے ممتاز رہے اور انہوں نے امتیاز کے ساتھ دریاست کی تکمیل کی۔ میں نے کم طلبہ میں ان جیسا علمی شوق دیکھا۔ دوران تعلیم وہ برابر مجھ سے ملتے رہے۔ ان کے علمی استفسارات اور کتب بینی کے ذوق سے مجھے خوشی ہوتی تھی۔ گزشتہ دو برس سے وہ ہمدرد طبی کالج، ہمدرد یونیورسٹی نئی دلی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے طبی مسائل پر جو ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور جو مضامین تحریر کئے ہیں ان کو یکجا کر کے کتاب کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ قدر اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور طبیبوں کی نوجوان نسل کی ذہنی و فکری تربیت میں اس سے مدد ملے گی۔

۲۲ر مئی ۱۹۹۷ء

OO

تقدمہ مفاتیح الغیب

حکیم حاجی قاضی سید محمد کرم حسینؒ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں تجارہ ریاست الور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام بلند اختر تھا۔ ساکرس ضلع گڑگانواں کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد کو سلطان علاء الدین خلجی کی (۱۳۱۶۔۱۳۹۶ء) قلعہ رنتھنبور کی فتح ۱۳۰۱ء/۷۰۱ھ کے بعد ساکرس کی قضا عطا کی گئی تھی۔ گردش بخت وزمانہ اس تاریخی خاندان کے ہونہار فرزند نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت خاندانی نام وروایات اور خاندانی عزت ووقار کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا۔ ابھی عمر کی نویں منزل ہی میں تھے کہ ۲۵/رمضان ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء کو ۶۹ سال کی عمر میں ان کے والد قاضی سید امداد علی ابن محمد اشرف ابن محمد رفیع ابن محمد زماں ابن قاضی حیات اللہ ابن قاضی عنایت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ ایک فرض شناس وباہمت نوجوان کی طرح انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا اور پورے عزم وحوصلہ سے زندگی کی تگ ودو کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ قصبہ ساکرس کی قضاۃ جو سینکڑوں سال سے ورثہ میں چلی آرہی تھی۔ اس پر قانع نہیں ہو سکے اور کم عمری ہی میں اپنے وقت کے مشہور طبیب حکیم محمد حسن حاذق میرٹھی کی خدمت میں تحصیل طب کے لیے میرٹھ پہنچے۔ قیافہ شناس اور لائق استاد نے چہرہ پر ذکاوت وذہانت کے آثار ابھرے پائے اور کمال ہمدردی سے گلے لگایا۔ آپ نے میرٹھ میں مسلسل دس سال قیام کر کے حکیم محمد حسن حاذق سے طبی درسیات کی تکمیل کی اور فنی رموز ونکات کو سمجھا۔ مطب ونسخہ نویسی کی تعلیم حکیم بلدیو سہائے میرٹھی تلمیذ خاص احترام الدولہ عمدۃ الحکماء معتمد الملک حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ طبیب خاص و وزیر اعظم سلطنت مغلیہ (وفات ستمبر

طبی اکادمی، دہلی، ۱۹۷۰ء

۱۸۷۳ء) سے حاصل کی۔ یہ حکیم بلدیو سہائے حکیم محمد حسن حاذق میرٹھی کے بھی استاد تھے۔ میرٹھ کے زمانہ قیام ہی میں حکیم سید کرم حسین نے متعدد علمی کام انجام دیے۔ قرابادین اعظم کے اردو ترجمہ میں حکیم محمد حسن حاذق کی اعانت کی۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے۔ "باصرار شفیق و مہربان مجمع خوبیہائے بیکران گوہر درج فضل و کمال فرخندہ سیرت یوسف جمال مقبول دارین جناب قاضی حکیم سید محمد کرم حسین صاحب ناطق تخلص رئیس تجارہ متعلقہ ریاست الور سن تیرہ سو گیارہ ہجری نبوی صلعم (مطابق ۱۸۹۳ء) میں زبان فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔" توضیح الادویہ، تفارق الامراض و تفارق الادویہ، طبی خالق باری، ترجمہ اقسرائی اور استاد کی دوسری کتابوں کی تالیف و ترجمہ میں شریک رہے۔ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں مطبع گلزار محمدی سے ایک قرآن شریف آپ کے تصدیقی دستخط سے شائع ہوا۔ ۱۸۹۴ء میں میرٹھ سے واپس آکر آپ نے تجارہ ریاست الور میں دواخانہ شفاء الامراض کی بنیاد رکھی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مقام حاصل کیا کہ حکومت کو اس کی ترقی و کام کی زیادتی کی وجہ سے دواخانہ میں ایک پوسٹ آفس کھولنا پڑا۔ یہ بات ہندوستان کے کم اداروں کو حاصل ہے اور اس زمانہ میں تو ایک بالکل نئی اور اہم بات تھی۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں ایک ماہانہ رسالہ "مسیحائے زماں" جاری کیا جو ۱۹۴۶ء تک شائع ہوتا رہا۔ آپ کی تصانیف و کارناموں نے دنیائے طب پر وہ لازوال نقوش ثبت کئے ہیں جو رفتہ رفتہ ابھر کر مختلف رنگوں سے رنگے ہوئے جلوہ جہاں آرا ہو رہے ہیں۔ آپ کی متعدد طبی و مذہبی کتابیں ہیں جن میں تحفہ جہاں المعروف کیمیائے عشرت، الحب من موہنی، تسخیر خلائق، حرز مرتضوی، درود مستغاث، سورہ یٰسین، چہل کاف، رسالہ معراج المومنین، مفاتیح الغیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نام و نمود اور عزت و شہرت کے کبھی خواہاں نہیں ہوئے۔ لیکن اساتذہ و مشاہیر فن کی صحبت و یکجائی ہمیشہ حاصل رہی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے جب ترقی و احیاء طب کی خاطر آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس قائم کی تو اپنے مشن کو

کامیاب بنانے کے لیے صوبہ راجپوتانہ سے حکیم سید کرم حسین کو منتخب فرمایا اور اسٹینڈنگ کمیٹی کا ممبر مقرر کیا۔ کانفرنس کے کاموں سے آپ بڑی دلچسپی لیتے رہے لیکن مسیح الملک کے انتقال کے بعد اطباء کے باہمی اختلافات اور ہنگاموں سے طبیعت ایسی اکتائی کہ پھر کبھی کسی جلسہ یا کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ چنانچہ ہمیشہ آل انڈیا ایورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس پٹیالہ و لاہور وغیرہ نے شرکت کے لیے مجبور کیا، اسی طرح راولپنڈی سے طب یونانی کی ترقی وبقا کی اسکیم اور اعلیٰ پیمانہ پر دواخانہ کے قیام کے لئے سرپرستی، انجمن طبیہ جے پور اور یونانی اینڈ ہومیو پیتھک مجلس اجمیر کی سرپرستی کے لیے مجبور کیا گیا لیکن قبول نہیں کیا اور خاموشی و سکون کے ساتھ فن کی خدمت کرتے ہوئے زندگی گزار دی۔

راستی و پاکبازی، تواضع وانکسار، نیک نفسی و استغنا آپ کے مسلک میں داخل تھا۔ بہت نازک مزاج اور حساس واقع ہوئے تھے، تصنع و بناوٹ سے دلی نفرت تھی۔ آپ کی خودداری کو اس خود پسندی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا جو علم و مرتبہ اور عزت و ثروت کے زعم سے پیدا ہو جاتی ہے بلکہ اس میں آپ کی پاک بینی، پاک نفسی اور پاک کرداری کو دخل تھا۔ غرور و نخوت کی آمیزش نہ تھی۔ ان صفات کے ساتھ ہی مسلک تصوف کی پوری پوری پیروی صبر و توکل، رضا و تسلیم اور ذکر و فکر نے آپ کو ایک عارف کے مرتبہ پر پہنچا دیا تھا۔ سیرت و کردار کے یہ وہ جوہر تھے جن سے انسانیت میں جمالیاتی شان پیدا ہوتی ہے اور انسانی شرف و مجد کے لیے انہی کو معیار بنایا جاسکتا ہے۔

تصوف سے آپ کے خاندان کو خاص تعلق رہا ہے، آپ کے اجداد میں حضرت میر عماد الدین اور حضرت میر برہان الدین سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کے والد قاضی سید امداد علی بہت متقی، پرہیز گار اور نقشبندیہ سلسلے میں بیعت تھے۔

حضرت عادل شاہ خاں خلیفہ حضرت امام علی کے خصوصی مریدوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت امام علی کے ایک مرید محمد عبدالکریم نے ان الفاظ کے ساتھ ان کی

خدمت میں شجرہ پیش کیا ہے۔ "شجرہ ہذا بپاس خاطر قاضی امداد علی صاحب یکے از مریدان و مرید خاص عادل شاہ خانصاحب..... مرحوم از دست بندہ محمد عبدالکریم خاں عفی عنہ نقشبندی یکے از غلامان غلام خاص بارگاہ صمدیت بروز ..... ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ"۔

قاضی امداد علی کا پہلا نکاح بی بی عجب دولت دختر میاں محمد یار و نواسی حضرت شاہ ابوالغیث سے ہوا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد دوسرا عقد فیاض النساء دختر حسین الدین (وفات ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ در حیدر آباد) سے کیا جن کے بطن سے ایک صاحبزادہ کرم حسین اور ایک صاحبزادی انوری بیگم تولد ہوئیں۔ حضرت شاہ ابوالغیث بہت عالی مرتبت بزرگ تھے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نواسی ہی ان کی وارث قرار پائیں۔ چنانچہ قاضی سید امداد علی کے حصہ میں اس رشتہ دامادی کی وجہ سے ایک کوٹھا اور رواق (رباخ) جو بفاوالے کوٹھے اور دوگئی کے درمیان واقع ہے بطور ورثہ رہا۔ حضرت شاہ ابوالغیث کے مزار کے خرچہ کے لیے چار روپیہ ماہوار ریاست الور کی طرف سے قاضی امداد علی کو ملتے تھے اصل میں یہ روپے ایک مسلمان ریاست کی طرف سے مقرر تھے جو مرہٹہ گردی میں ختم ہوگئی۔ مرہٹوں نے جب حملہ کیا تو نواب کا نمائندہ میاں محمد یونس جد میاں سلام اللہ شاہ کے پاس آیا اور ان سے دعا و عمل کا خواستگار ہوا۔ انہوں نے شدید اصرار پر عمل "انا اعطینا" بتایا وہ شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ریاست ختم ہوگئی۔[۱۱]

چونکہ پروانہ مزار قبضہ میں تھا اس لیے بعد میں بھی اس کی بحالی رہی۔ حضرت شاہ ابوالغیثؒ کا مزار بازار تجارہ کے راستہ کے اختتام پر متصل ہولی ٹیہ واقع ہے۔ قاضی امداد علی ہر جمعرات کو شاہ ابوالغیث کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے اور انتظام ضروری متعلقہ مزار و فاتحہ خوانی انجام دیتے تھے۔ حکیم کرم حسین کے ہمشیرہ زادہ عموی قبلہ محمد یٰسین مدظلہ کا بیان ہے کہ "مجھے میری والدہ محترمہ مرحومہ (انوری بیگم دختر قاضی امداد علی) نے سنایا تھا کہ ایک مرتبہ کوئی ضعیف العمر خاتون مکان پر آئیں

اور بہت غور سے والدہ مرحومہ کو دیکھنے لگیں۔ والدہ نے استفسار کیا جواب دیا کہ ایک صاحب شاہ ابوالغیثؒ کے مزار پر آیا کرتے تھے ان کی مشابہت تم میں بہت ہے۔ والدہ نے ان سے کہا کہ وہ میرے والد تھے جو وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔"

حضرت میاں محمد سلام اللہ شاہؒ متوفی ۴ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء متوطن تجارہ سلسلہ ابوالعلائی کے اپنے وقت کے زبردست بزرگ تھے اور ایک بلند خانوادہ عالیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خانوادہ کے سبھی بزرگ مصدر رشد وہدایت اور غواص بحر طریقت تھے۔ حکیم کرم حسین نے حضرت میاں سلام اللہ شاہؒ سے شرف بیعت حاصل کیا اور دستار خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت کو آپ سے غیر معمولی تعلق اور انس تھا، کمال شفقت فرماتے تھے، اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو گود لے کر اپنا جانشین بھی بنانا چاہتے تھے۔ ان کا سلسلہ اس طرح ہے۔ حضرت میاں محمد سلام اللہ شاہؒ ابن حضرت شاہ محمد روح اللہ (متوفی ۶ / صفر ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء) ابن حضرت شاہ محمد یحییٰ (متولد دوشنبہ ۱۱ صفر) شاہ محمد یحییٰ کے برادر گرامی حضرت شاہ محمد احمد عرف شاہ یونس (متولد ۲۵ / شوال ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳ء متوفی ۱۳ / ذی الحج ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء مسند سجادگی پر فائز تھے۔ حضرت شاہ محمد روح اللہ کو اپنے عم محترم سے جانشینی ملی تھی) ابن اسرار غیب حضرت شاہ محمد شعیب (متولد ۱۰ / رمضان المبارک ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء متوفی ۲۲ جمادالثانی ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء) عن شیخ المشائخ حضرت شاہ غلام نبی (۲۱ / رمضان المبارک ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء) فیروز پور جھرکہ عن شیخ المشائخ حضرت لعل محمد کوٹ قاسمی المعروف لاڈ خاں عن شیخ المشائخ حضرت سیدنا امیر ابوالعلاء اکبر آبادیؒ۔

حضرت شاہ محمد شعیبؒ سے تجارہ میں سجادگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور چھتہ محلہ قاضی واڑہ میں خانقاہ شعیبیہ قائم ہوئی۔ صدر دروازہ پر خانقاہ شعیبیہ تجارہ ۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء لکھا ہوا ہے۔ شاہ محمد شعیبؒ کے دادا علی محمد بن علی اکبر بن عبدالسلام بن محمد مراد نرخی نے تجارہ میں محلہ قاضی واڑہ میں ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء میں چھتہ بنوایا تھا۔ نواب خان زماں بہادر کے عہد میں خدمت کڑوڑ گیری وغیرہ دارالخلافہ کی ان سے متعلق

تھی۔ بہت صاحب اقبال شخص تھے۔ قاضی عبدالباقی ۶۲ نے انہی کے زمانہ میں محلہ قاضی واڑہ کے عالی شان بلند دروازے درست کرائے تھے۔ علی محمد کڑوڑی کے بڑے صاحبزادے عبدالواحد کا ساکرس میں بی بی اللہ رکھی دختر ابو مسلم سے نکاح ہوا۔ ان سے شاہ محمد شعیب پیدا ہوئے۔ قطعہ تاریخ ولادت:

چہ گویم حالت جسم عناصر رود ایں آب و خاک و آتش و باد
بخاطر رفت تاریخ ولادت بگوید ناکند عمرم کسے باد
شب ہشت و دوئم در شہر رمضان فقیر آمد بکون حسرت آباد

۱۱۳۸ھ

میاں محمد شعیبؒ نے سترہ سال کی عمر میں حضرت شاہ غلام نبی ۶۳ (فیروز پور جھرکہ) سے بیعت کی میاں صاحبؒ کے والد شیخ عبدالواحد کا وصال ۳/ جمادی الاول ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء اور والدہ کا انتقال جمعہ ۷/ رجب ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء کو ہوا۔ حکیم کرم حسین کو میاں محمد شعیبؒ سے روحانی وابستگی کے ساتھ ہی خاندانی قرابت بھی حاصل تھی اور صرف یہی ایک رشتہ نہیں تھا کہ میاں صاحب کی والدہ ساکرس کی تھیں، بلکہ میاں محمد شعیب (ولد عبدالواحد ولد علی محمد ولد علی اکبر) کے دادا علی محمد کے حقیقی بھائی علی اصغر کی دختر ماہ بی بی کا نکاح محمد سعید ولد حسین محمد سے ہوا تھا۔ اور ان کی صاحبزادی فضل النساء (دختر محمد سعید) کی شادی حکیم کرم حسین کے پردادا قاضی محمد رفیع ۶۴ (متوفی ۱۸/ ربیع الاول ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) سے ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے محمد اشرف (دادا حکیم کرم حسین) و شمس الدین اور ایک دختر خاندولت پیدا ہوئیں۔ خاندولت میاں محمد یونس شاہؒ سے منسوب تھیں لیکن شادی سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ محمد یونسؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"محمد سعید بہ مسماۃ ماہ بی بی بنت علی اصغر ولد علی اکبر کہ برادر میانہ جد ما است کتخدائی نمودہ از دو دو پسر رحم علی و فضل علی و دو دختر م کرم النساء و فضل النساء پیدا بود ایں فضل النساء دختر خرد محمد سعید بہ محمد رفیع ولد محمد زماں ابن قاضی حیات اللہ فرزند قاضی

عنایت اللہ ساکن قصبہ ساکرس کتخدا شدہ واز او شاں دو پسر محمد اشرف و شمس الدین ویک دختر بنام خاندولت متولد گشتہ، خاندولت منسوب بایں فقیر شدہ بود نا کتخدا ازیں دار رحلت نمود۔"

مزید بر آں خود شاہ محمد شعیبؒ کی پہلی شادی ساکرس میں اپنے ماموں کی بیٹی امرۃ النساء سے ہوئی جن سے ایک دختر عظمت النساء پیدا ہوئیں۔ دوسرا نکاح بھی ساکرس میں بڑے ماموں محمد مکارم کی لڑکی سے ہوا۔ جن سے تین لڑکے محمد یونس، محمد یحییٰ اور سمیع اللہ اور دو لڑکیاں بخت دولت اور صاحب النساء پیدا ہوئیں۔ اس طرح میاں محمد شعیب صاحبؒ اور میاں محمد یونس دونوں کا ننھیال ساکرس تھا۔

میاں محمد شعیبؒ تصنیف اور بہت بافیض بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں میں اذکار الابرار، احوال الاخیار، نگارستان مسلمان اور منظوم تاریخ تجارہ ہیں۔ نگارستان مسلمان کا نسخہ خود مصنف کے قلم کا جد محترم کے ذخیرہ میں مجھے ملا ہے۔ میر مسلمان ۶۵ (متوفی ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء) میاں محمد شعیبؒ کے استاد تھے، انہی کے نام پر یہ کتاب ہے۔ تاریخ تجارہ منظوم کی نقل بھی راقم الحروف کے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

میاں سلام اللہ شاہ کے علاوہ حکیم کرم حسین نے حضرت حافظ قاری سید عابد علی شاہؒ چشتی قادری متوفی ۱۹۰۸ء اور ان کے وصال کے بعد ان کے برادر ذی وقار وجانشین حضرت حافظ میاں واحد علی شاہ مدظلہ (الور) سے فیض روحانی حاصل کیا۔ حضرت میاں واحد علی شاہ نے آپ کو خرقہ خلافت سے بھی ممتاز فرمایا۔ حکیم کرم حسین کا تعلق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ حضرت میاں عابد علی شاہ کے عرس میں اپنی تمام مشغولیات کے باوجود پابندی سے الور تشریف لے جاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک وضع میں کبھی فرق نہیں آیا۔ حضرت قبلہ میاں واحد علی شاہ "تجلیات مرشد" سوانح حضرت میاں عابد علی شاہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء حضرت قبلہ عابد علی شاہ نے قصبہ تجارہ کا سفر کیا اور وہاں قصبہ سے باہر جانب غرب حضرت غازی غزن

شاہ (ولایت) کے مزار پر ایک شب قیام فرمایا، اہل قصبہ کو پتہ چلا کہ مزار مبارک پر کوئی بزرگ قیام پذیر ہیں تو وہ آئے اور حضرت مخدومی سے ملے۔ آنے والے حضرات میں بیشتر معزز اور ذی علم لوگ تھے، جناب حکیم کرم حسین بھی ان میں شامل تھے۔

حضرت مخدومی کی تھوڑی دیر کی ہی گفتگو اور صحبت نشینی نے سامعین کو ایسا مسحور اور گرویدہ کر دیا کہ کچھ نہ پوچھئے اور آخر حکیم کرم حسین صاحب اصرار کے ساتھ اپنے مکان پر آپ کو لے گئے۔ وہاں آپ دو تین روز قیام فرما رہے۔ اس مدت میں ہر وقت آدمیوں کا مجمع آپ کے پاس لگا رہتا تھا۔ اور آپ سے وعظ اور پند و نصائح اور تصوف و عرفان کے مسائل سنتا رہتا تھا۔ لوگوں کو آپ سے بے حد عقیدت اور محبت ہو گئی تھی۔ اکثر نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ حکیم کرم حسین صاحب کو بھی پہلے ہی دن سے انتہائی عقیدت ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی سلسلہ میں داخل ہو گئے اور ان کی محبت و عقیدت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا، وہ اکثر و بیشتر آپ کی خدمت مبارک میں الور حاضر ہوتے رہتے تھے، آپ کے وصال کے بعد عرس شریف کے موقع پر ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۷ء تک بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ حکیم صاحب بہت مخلص، باوفا اور باوضع احباب میں تھے۔ اس لیے عرس مبارک میں غیر حاضری نہیں ہوئی بلکہ عرس شریف کے علاوہ بھی اکثر حاضر ہوتے رہتے تھے۔"[۶۶]

حضرت قبلہ میاں واحد علی شاہ کے تعلق کی بھی یہی نوعیت تھی از راہ الفت و عنایت سال میں ایک یا دو مرتبہ تجارہ ضرور تشریف لاتے، حکیم صاحب کے ہاں مہینہ ڈیڑھ مہینہ قیام رہتا۔ اور رشد و ہدایت، تلقین و ذکر کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ اس خاندان سے تعلق و وابستگی نے یہ شکل اختیار کی کہ حضرت نے آپ کے بڑے صاحبزادہ حکیم حافظ حاجی سید محمد عتیق القادر کو پانچ سال تک اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا اور وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ حضرت کی نگاہ کرم اور بزرگوں کی نسبت عالی کہ حکیم کرم حسین صاحب کے دونوں صاحبزادے عمومی حکیم سید محمد

عتیق القادر اور والد محترم حکیم سید محمد فضل الرحمٰن بھی نعمت خلافت سے بہرہ یاب ہوئے۔

حضرت میاں واحد علی شاہ مدظلہ اور حضرت میاں عابد علی شاہ حضرت پیر جی احمد شاہ قدس سرہ (متوفی ۲ شوال ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء بعمر ۸۱ سال) رامپور مصنف رسالہ کاشف الاسرار ۶۷ کے ارشد خلفاء میں تھے۔ حضرت پیر جی احمد شاہ نے حضرت مولانا جمال شاہ مصطفیٰ آبادی ۶۸ (متوفی ۲۸ / شعبان ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء) سے شرف بیعت و خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ حضرت معین الدین عرف شاہ خاموش (حیدر آباد) اور حضرت امیر شاہ (رامپور) سے بھی آپ کو خرقہ خلافت عطا ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے حضرت میاں واحد علی شاہ قبلہ حیدر آباد پاکستان میں مقیم ہیں۔ جہاں آپ کے فیوض و برکات اور روحانی تصرفات سے ایک زمانہ مستفید ہو رہا ہے۔

۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء میں بموقعہ عرس سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری حضرت محمد الازہری کے ایک نائب مکہ معظمہ سے تشریف لائے اجمیر میں میاں سلام اللہ شاہؒ کے ہمراہ حکیم کرم حسین بھی اس موقع پر موجود تھے۔ حکیم صاحب کو ان بزرگ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنے سلسلہ عالیہ کی منسلکی سے مفخر فرماتے ہوئے اپنے اوراد شریفہ کی اجازت عطا فرمائی۔ وہ اجازت نامہ درج ذیل ہے۔

الشجرة الطريقة الاحمدية الادريسية الرشيدية المحمدية الشاذلية لا اله الا الله محمد رسول الله فى كل لمحة و نفس عدد ماوسعه علم الله۔ اعلم انى قد لقنت هذه الاوراد الشريفة السنية و الطريقة الاحمدية الرشيدية المحمدية نيابة عن شيخى رضى الله عنه للاخ فى الله والمحب فى طريق الله تعالىٰ سيد كرم حسين ولد قاضى امداد على مورخه ٤ رجب ١٣٢٤ھ كما تلقيتها عن شيخى و استاذى مربى روحى صاحب المدد الراوى سيدى محمد ابن احمد الدندراوى ادام الله لنا وجوده و امد نا بمده على الدوام كما اخذها شيخنا

المتقدم ذكره عن شيخه و استاذه القطب الفريد سيدى السيد ابراهيم الرشيد وهو اخذها عن شيخه و استاذه القطب الرئيس سيدى السيد احمد بن ادريس وهو اخذها عن شيخه العارف بالله التعالىٰ قطب وقته و غوث عصره سيدى عبدالوهاب التازى وهو اخذها عن شيخه العارف بالله تعالىٰ صاحب الذهب الابريز سيدى عبدالعزيز الدباغ رضى الله عنهم اجمعين و امدنا باسرارهم آمين و هو اخذها عن شيخه و مربى روحه سيدنا الخضر عليه السلام و اخذها عن جمال الكونين و سيد الثقلين سيدنا و مولانا محمد صلى الله عليه و آله و سلم عن جبريل عليله السلام عن ميكائيل عليه السلام عن اسرافيل عليه السلام عن اللوح عن القلم عن الجليل جل جلاله و تقدست اسمائه و صفاته و صلى الله على سيدنا محمد و على آله فى كل لمحة و نفس عدد ماوسعه علم الله الراقم الفقير لربه الغنى محمد الازهرى (مہر)

یہ اوراد جلیلہ ایک مجموعہ میں شامل ہیں جس کا ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء کا ترکی کا مطبوعہ نسخہ جد محترم کے پاس تھا اور وہ محفوظ ہے۔ اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل اوراد ہیں۔

۱۔ المحامد الثمانیۃ ۲۔ الاحزاب الخمسۃ ۳۔ الصلوات الاربع عشرۃ ۴۔ الحزب السیفی ۵۔ الحصون المنیعۃ النبویۃ اس مجموعہ کے حاشیہ پر جو رسائل ہیں وہ رسالۃ القواعد، رسالۃ الاساس، روح السنۃ اور کیمیاء الیقین ہیں۔ یہ تمام اوراد و رسائل قطب دائرۃ التقدیس مولانا سید احمد بن ادریس قدس سرہ کے ہیں۔ سوائے الحزب السیفی کے اس کی روایت اور سند سیدنا و مولانا حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ہے۔

۱۹۳۴ء / ۱۳۵۲ھ میں جب حکیم کرم حسین (بڑے صاحبزادہ حکیم سید عتیق القادر، اہلیہ محترمہ حکیم النساء اور ہمشیرہ عزیزہ انوری بیگم بھی اس سعادت میں شریک تھے) حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت سید محمد الازہری انتقال کر چکے

تھے۔ اور مکہ مکرمہ میں ان کے فرزند حضرت ابوالعباس الدندراوی جانشینی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے حکیم صاحب سے اپنے والد بزرگ کے قدیم تعلق کی بنا پر نہایت خصوصیت کا برتاؤ کیا اور مستحق خلافت سمجھتے ہوئے سند خلافت سے سرفراز فرمایا اور اپنی مہر عطا کی۔ اس زمانہ میں سیدی سندی حضرت ابو العباس بن حضرت سید محمد بن احمد الدندراوی متصل جنت المعلی ایک چھوٹی سی پہاڑی جو باب الدندراوی کہلاتی تھی مسکن گزیں تھے۔ نقل سند یہ ہے۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره ونومن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا من يهدى الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له. اما بعد فقد اجزت من فلان لاخى فى الله و المحب فى طريق الله السيد كرم حسين بن قاضى امداد على ساكن تجاره من نواح الور كما تليقتها عن شيخى و استاذى و مربى روحى و والدى صاحب المدد الراوى سيدى السيد محمد بن سيد احمد الدندراوى رضى الله عنه و عن مشائخنا الاجمعين كما اخذها هو عن شيخه و استاذه القطب الفريد سيدى السيد ابراهيم الرشيدوهو اخذها عن شيخه و استاذه القطب الرئيس سيدى السيد احمدابن ادريس وهو اخذها عن سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم باجتماع صورى و صلى الله سيدنا و مولانا محمد صلى الله عليه وسلم. (مهر محمد ابوالعباس الدندراوى)

یہ حضرات اہل سلاسل رویت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مشہور و معروف ہیں۔ حضرت شاہ نور الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شہرۂ آفاق میں جہاں اور اہل سلاسل کا تذکرہ کیا ہے۔ صفحہ ۳۷۰ میں لکھا ہے کہ "راقم کو شیخ عبدالاحد سلیمانی صوفی سے رویت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنچی ہے اور ان کو شیخ ابراہیم رشیدی سے اور ان کو حضرت سید احمد ادریس وغیرہم سے۔"

جد محترم حکیم کرم حسین ایک کتاب کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔ "واضح ہو کہ سیدی احمد بن ادریس قدس سرہ کو حق جل جلالہ نے محمدی عطایا اور علوم لدنیہ کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا اور آپ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صوری و معنوی ملاقاتیں حاصل تھیں۔ اور آپ حضورؐ سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت نے ہی آپ کو سلسلہ شاذلیہ کے اوراد کی تلقین فرمائی تھی اور کچھ دوسرے اذکار کی خصوصیت سے ادا کئے جانے کی اجازت دی تھی۔ لہٰذا آپ آں حضور کے شاگرد اور مرید فرمائے گئے ہیں۔

حضرت سید احمد بن ادریس فرماتے ہیں کہ مجھے آں حضورؐ محبوب رب غفور سے صوری و معنوی حضوری ہوتی رہی ہے۔ آپ کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام بھی تھے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا کہ وہ مجھ کو سلسلہ شاذلیہ کے اوراد سے مفتخر فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ کی موجودگی میں تلقین کی۔ پھر حضورؐ کا ارشاد ہوا کہ اے خضرؑ ان کو تمام اذکار جامعہ اور درود کاملہ اور استغفار عظیمہ کی بھی تعلیم دو۔ جو ثواب و تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوں۔"

مدینہ منورہ میں حکیم صاحب کو شیخ الدلائل السید عبدالفتاح بن السید محمد رضوان المدنی سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ شیخ الدلائل نے حکیم صاحب میں روحانی اثرات نمایاں دیکھے اور آپ کو دلائل الخیرات کی سند و حزب الاعظم کی اجازت عطا کرتے ہوئے دلائل الخیرات کا ایک نسخہ مطبوعہ استنبول ۱۹۲۶ء جس کے آخر میں مع دستخط و مہر ایک سند بھی منسلک ہے، عنایت کیا۔

حکیم صاحب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ حج کے موقع پر جہاں ہر سال لاکھوں حاجی حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں ایک بزرگ نے ایک نہایت بیش قیمت خوش خط مطلی و مذہب قلمی قرآن شریف بلا کسی ہدیہ کے عطا فرمایا۔ یہ نسخہ داؤد الحفظی بوسنوی من تلامیذ اسمٰعیل الزہدی آفندی کاتب السرای السلطانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس کی کتابت ۲۴ رجب ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں مکمل ہوئی ہے۔ یہی قرآن شریف حکیم

صاحب کے مطالعہ میں رہتا تھا۔

۲۹ر ذی قعدہ کو حکیم صاحب کی سعودی عرب کے وزیر جناب محمد سلیمان سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی۔ دوسرے مسائل کے علاوہ طب واطباء سے متعلق تفصیلی گفتگو رہی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ اطباء کو سعودی عرب میں علاج کی اجازت نہیں ہے، انہیں نہ صرف معالجہ سے روکا جاتا ہے بلکہ دوسرے ممالک سے یونانی دواؤں کے آنے پر بھی یہاں پابندی ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر کا اجازت نامہ ضروری ہے۔ یونانی ادویہ منگانے کے لیے ڈاکٹر کی اجازت کی شرط کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ڈاکٹر لیبل دیکھے بغیر خود اپنی دوائیں نہیں پہچان سکتے ہیں۔ یونانی دوائیں شرعی ممنوعات سے مبرا ہوتی ہیں۔ عربوں نے طب یونانی میں جو اضافات کیے اور طب یونانی سے اس ملک کا جو تعلق رہا اس کے پیش نظر عرب میں طب یونانی پر یہ قدغن ہمارے لیے نہایت تکلیف کا باعث ہے۔" حکیم صاحب نے جلالۃ الملک سے ملنے اور اپنی کتابیں پیش کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی جسے انہوں نے نہایت خوش دلی اور خندہ پیشانی سے منظور کیا اور طب یونانی سے متعلق نیک خواہشات ظاہر کرتے ہوئے سعودی عرب میں بہتر اقدامات کا وعدہ کیا۔

۴ر ذی الحجہ کو "ادارت تعمیرات عین زبیدہ" کی طرف سے نہر زبیدہ کی تعمیر کے سلسلے میں ایک میٹنگ میں مدعو کیا گیا اور ۶ر ذی الحجہ کو آپ نے جلالۃ الملک کی جانب سے مخصوص حاجیوں کو دیئے گئے عشائیہ میں شرکت کی۔ جلالۃ الملک نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے قرآن وسنت کے اتباع پر زور دیا اور اپنے حنبلی ہونے کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت امام اعظم کا نہایت احترام سے نام لیا اور ان سے اپنی عقیدت ظاہر کی۔

حج سے واپسی پر جدہ میں جہاز کے انتظار میں ٹھہرنا ہوا۔ جدہ میں مامور ہندوستان کے قونصل جنرل خان بہادر حاجی احسان اللہ خاں کو جب حکیم صاحب کی موجودگی کا علم ہوا، تو انہوں نے سعودی عرب کے ایک وزیر کو دکھانے کی خواہش کی۔ جنہیں یہ خیال تھا کہ ان کے اوپر کسی نے کوئی عمل کر دیا ہے۔ چنانچہ انہیں مکہ معظمہ سے جدہ بلایا

گیا۔ حکیم صاحب نے انہیں ملاحظہ فرما کر ایک تعویذ دیا اور فرمایا کہ خواب میں آپ کو سب حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ دوپہر میں انہیں خواب میں کوئی بات نہیں معلوم ہو سکی۔ فرمایا کہ رات کو جب آپ سوئیں تو پھر اس تعویذ کو سرہانے رکھ لیں، انشاءاللہ عمل یا مرضی صورت کا علم ہو جائے گا۔ چنانچہ انہیں خواب میں معلوم ہو گیا کہ فلاں فلاں صاحب نے ان پر کچھ عمل کیا ہے۔ بعد میں اس کے ازالہ کے لیے آپ نے انہیں تعویذ دیے اور ان کی شکایات رفع ہوئیں۔

جد محترم رحمۃ اللہ علیہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات گرامی سے بے حد عشق تھا۔ بہت وار فتگی اور کیفیت کے ساتھ ان کا ذکر فرماتے تھے۔ روضہ نبویؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ لیکن حضرت غوث پاک کے آستانہ پر حاضری کی ہمیشہ تمنا کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں جب والدی حکیم سید محمد فضل الرحمٰن مدظلہ کو حضرت خواجہ الحاج حمید الدین شاہ (متوفی ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۸ء) سجادہ شین حضرت خواجہ خانون قدس سرہ (۹۴۰۔۸۵۳ھ ۱۵۳۳۔۱۴۴۹ء) شاہ ولایت گوالیار کے ہمراہ کربلائے معلیٰ، کاظمین نجف اور بغداد شریف جانے کا موقع ملا، تو ایک شب جب وہ آستانہ غوث پاک میں خوابیدہ تھے فجر کی نماز کے وقت تک بیدار نہیں ہوئے۔ انہوں نے بحالت خواب محسوس کیا کہ والد صاحبؒ کے اوراد و وظائف پڑھنے کی آواز کانوں میں آ رہی ہے۔ بعد میں ان سے کچھ اس طرح فرمایا۔ اٹھو نماز کا وقت ہو گیا ہے اور پھر فوراً ان کی نیند کھل گئی۔

حضرت ابو الاحمد الملقب سید شاہ علی حسین اشرفی جیلانی ۶۹ (۱۳۵۶۔۱۲۶۶ھ ر ۱۹۳۷۔۱۸۴۹ء) سجادہ نشین آستانہ عالیہ درگاہ کچھوچھہ شریف نے ۱۴ر جمادالاول ۱۳۴۳ھ ر ۱۹۲۴ء کو حکیم کرم حسین کو قصیدہ غوثیہ کی اجازت عمل و قرات کی سند عطا فرمائی۔ اسی طرح حضرت مولانا رکن الدین نقشبندی مجددی الوری ۷۰ے (متوفی ۲۲ شوال ۱۳۵۵ھ ر ۱۹۳۶ء) حضرت محبوب لعل شاہؒ ۷۱ے حضرت میاں کمبل پوشؒ ۷۲ے اور حضرت میاں کلن شاہؒ ۷۳ے سے بھی جد محترم کو خصوصی نسبت حاصل تھی۔ حضرت مولانا رکن

الدینؒ نے بھی آپ کو قصیدۂ غوثیہ کی اجازت عطا فرمائی تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے ہاں ماحضر پر میاں سلام اللہ شاہ، خواجہ واحد علی شاہ، میاں کمبل پوش اور مولانا رکن الدین تشریف فرما تھے، میاں کمبل پوش نے فرمایا! حکیم صاحب آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ بیک وقت چار بزرگ آپ کے مکان پر تشریف فرما ہیں۔

بزرگوں سے انہیں ایک خاص ارادت تھی۔ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی نقشبندی خلف حضرت شاہ ابواحمد بھوپال کو آپ سے تعلق تھا۔ چنانچہ وہ بغرض علاج بھوپال سے تجارہ تشریف لے گئے تھے۔ تقریباً ایک ماہ حکیم صاحب کے ہاں ان کا قیام رہا اور پوری توجہ و تعلق سے انہوں نے ان کا علاج کیا۔ اسی طرح حضرت مولانا الیاس بانی جماعت تبلیغ نے بھی حکیم صاحب کے مکان کو اپنے ورود سے مفتخر فرمایا تھا۔

حکیم صاحب ریاست الور کے بہت بااثر ذی حیثیت اور صاحب ثروت لوگوں میں تھے اور اپنے ذاتی و خاندانی وقار و وجاہت کی وجہ سے بہت منفرد اور ممتاز سمجھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دینی و دنیوی دونوں نعمتوں سے نوازا تھا۔ قومی و ملی کاموں سے آپ کو پوری دل چسپی رہی، بچوں کی دینی تعلیم کے لیے اسلامیہ اسکول تجارہ قائم کیا، جہاں مہاراجہ جے سنگھ والیٔ ریاست الور بھی تشریف لائے تھے۔ اسی طرح ایک موقع پر انگریز وزیر اعظم ریاست میجر کیمبل نے حکیم صاحب کے دولت کدہ کو اپنی حاضری سے رونق بخشی تھی۔ حکیم صاحب نے جامع مسجد تجارہ کا سنگ مرمر کا بلند صدر دروازہ تقریباً دس ہزار روپیہ کے ذاتی صرفہ سے تعمیر کرایا، صاحبزادہ حکیم سید فضل الرحمٰن کی شادی کے موقع پر قصبہ کے تمام لوگوں کی دعوت کی، مضافات کے لوگ بھی بڑی تعداد میں مدعو کیے گئے اور آٹھ ہزار سے زیادہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے دعوت ولیمہ میں شرکت کی، متعدد انجمنوں واداروں کو آپ کی سرپرستی حاصل رہی، شاعری سے بھی ذوق تھا، ناطق تخلص فرماتے تھے کلام میں تصوف کا رنگ غالب تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں تجارہ اور الور میں فسادات کے سبب گھر کا ساز و سامان، کتب خانہ، دواخانہ اور بزرگوں کا تمام سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا۔ انتہائی بے سر و سامانی اور پریشان حالی میں بھوپال پہنچے، جہاں تقریباً سوا سو سال سے آپ کے خاندان کی ایک شاخ آباد تھی۔

ہندوستان میں قیام کے فیصلہ کے بعد آپ کے دونوں صاحبزادوں حکیم حافظ حاجی سید محمد عتیق القادر اور حکیم حاجی سید محمد فضل الرحمٰن نے بھوپال میں دواخانہ شفاء الامراض کو از سر نو قائم کیا اور نامساعد حالات میں محنت و جانفشانی سے دواخانہ کے کام کو ترقی دی، جس کی بدولت شہر و بیرون شہر کے لوگ بڑی تعداد میں فیض پا رہے ہیں۔ دواخانہ کی مصنوعات اپنی شفا بخشی اور اثرات کے لحاظ سے ملک میں ایک امتیاز رکھتی ہیں اور ۷۵ سال کے طویل عرصہ میں لاکھوں مریضوں پر کامیاب تجربات نے اس کے مرکبات کو نہایت مفید اور قابل اعتماد بنا دیا ہے۔

حکیم کرم حسین کے منجھلے بھانجے حکیم محمد مبین احمد جو تجارہ میں دواخانہ کے منیجر اور پوسٹ آفس دواخانہ شفاء الامراض کے پوسٹ ماسٹر تھے۔ ترک وطن کر کے ۱۹۴۸ء میں پاکستان تشریف لے گئے اور سندھ میں ٹنڈو الہ یار میں اقامت گزیں ہوئے۔ اپنی حذاقت اور دست شفا سے انہوں نے اس علاقہ میں بڑی نام آوری اور شہرت حاصل کی۔ قصبہ اور قرب وجوار کے صدہا مریض روزانہ ان کے مطلب میں آتے تھے اور شفا پاتے تھے۔ ۱۸ر اگست ۱۹۶۳ء کو ان کے انتقال سے وہاں کے لوگ ایک مسیحا نفس طبیب اور باوضع مخلص و غمگسار انسان سے محروم ہو گئے۔ آج بھی وہ نہایت عقیدت و احترام سے ان کا نام لیتے ہیں۔ اور ان کے طبی کارناموں کو یاد کرتے ہیں۔

بھوپال میں ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء کو ۸۱ سال کی عمر میں حکیم کرم حسین کی اہلیہ حکیم النساء کا انتقال ہوا اور ڈھائی سال بعد ۲۵ر جون ۱۹۵۳ء مطابق ۱۱ر شوال ۱۳۷۲ھ کو ۸۵ سال کی عمر میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور وہیں جنسی جہانگیر آباد کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ جناب شبیر حسین اختر الوری نے

قطعہ تاریخ کہا ہے۔

سر جھکا کر آمودب بیٹھ جا پڑھ فاتحہ
اک ولی اللہ بااخلاص کی تربت ہے یہ
قاضی و سید حکیم و حاجی کرم حسین
خیر اندیش عوام الناس کی تربت ہے یہ
جو تجارہ راجپوتانہ کا تھا کامل طبیب
اس سراپا پیکرِ احساس کی تربت ہے یہ
عالم عرفاں میں جس کا نام روشن ہو گیا
محرم اسرار پاس انفاس کی تربت ہے یہ
گیارہ شوال المکرم کو گیا وقت عشاء
سال لکھ اختر مسیح انفاس کی تربت ہے یہ

عبادت اور یاد الٰہی کا یہ عالم تھا کہ قبلہ تایا صاحب و والد صاحب مدظلہما کا بیان ہے کہ چالیس سال تک اپنے ہوش میں انہوں نے کبھی ان کی نماز تہجد قضا ہوتے نہیں دیکھی۔ ان کا معمول تھا کہ رات کے تین بجے بیدار ہو جاتے تھے اور صبح تک اوراد و وظائف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے مرحوم کی طبی حیثیت اور دوسرے حالات "حیات کرم حسین" کے نام سے ایک مستقل تصنیف میں پیش کیے گئے ہیں۔

مفاتیح الغیب کا قلمی نسخہ جو خانقاہ شعیبیہ تجارہ کے ذخیرہ کتب میں تھا۔ جد محترم کو حضرت میاں سلام اللہ شاہؒ نے عطا فرمایا تھا۔ اس نسخہ کو میاں محمد یونس کی حسب فرمائش نقل کیا گیا ہے اور اس کی کتابت ۲۱ ربیع الاول ۱۲۲۴ھ میں مکمل ہوئی ہے۔ نسخہ راقم کے پاس محفوظ ہے اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔ "تمت بالخیر فالنامہ بحسب فرمائش میاں محمد یونس صاحب فی یوم الجمعہ والتاریخ احدیٰ و عشرون من الربیع الاولیٰ والسنۃ من الہجرۃ النبویۃ صلی اللہ علیہ و آلہ الف مائتان اربع و عشرون علی التطابق

الجلوس شاہ عالم اربع وار بعین بید احقر العباد سید ظہور علی ساکن مڈہ غفر اللہ ذنو بھاو ستر عیو بھاو عاقبت بخیر گردان منہ و کرمہ"

یہ نسخہ فارسی میں ہے جد محترم نے اردو میں ترجمہ کر کے اسے شائع کیا تھا۔ پہلی اشاعت پر سنہ طباعت نہیں ہے لیکن اس پر میاں سلام اللہ شاہؒ کے نام کے آگے ادام اللہ وجودہ لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی وفات ۱۹۱۶ء سے قبل شائع ہو چکا تھا۔ دوسری مرتبہ یہ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں طبع ہوا ہے۔ اب تیسری مرتبہ مترجم کے مختصر حالات کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

دہلی ۶/ نومبر ۱۹۶۹ء

حواشی

۱ طبی کانفرنس کے پندرہویں سالانہ اجلاس منعقدہ رامپور ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵/ اپریل ۱۹۲۷ء کی روئداد ص:۶۶

۲ خوش قسمتی سے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا یہ خط محفوظ ہے۔

۳ طبیہ کالج میگزین علی گڑھ جلد:۱، شمارہ:۲، ص:۶۷

۴ اخبار الحکماء ابن قفطی صفحہ ۴۲ مطبع سعادۃ مصر ۱۳۲۶ھ

۵ بغداد کے نامور اطبا میں ہے۔ بیار ستان عضدی میں رئیس الاطباء کے منصب پر رہا، ۳/ رمضان ۴۴۴ھ/ ۱۰۵۲ء تاریخ وفات ہے۔ اخبار الحکماء صفحہ ۲۲۱

۶ الفہرست ابن ندیم صفحہ ۲۸۴، مطبوعہ لیپزگ ۱۸۷۱ء

۷ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۲۷، اخبار الحکما صفحہ ۵۵

۸ اخبار الحکماء صفحہ ۸۰

۹ تاریخ مختصر الدول ۳۰۳، مطبوعہ بیروت ۱۸۹۰ء

۱۰ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۲۷، اخبار الحکما صفحہ ۸۰

۱۱ اخبار الحکماء صفحہ ۷۸، طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۳۰

۱۲ تاریخ مختصر الدول صفحہ ۲۹۱، اخبار الحکماء ۲۹۹

۱۳ اخبار الحکماء صفحہ ۵۴۔۵۵

۱۴ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۳۰، مطبع وہبیہ مصر ۱۸۸۲ء

۱۵ مختصر الدول صفحہ ۲۷۴، اخبار الحکماء صفحہ ۱۸۵

۱۶ اخبار الحکماء صفحہ ۱۳۰

۱۷ وفیات الاعیان جلد ا صفحہ ۱۰۱

۱۸؎الفہرست صفحہ ۳۰۲

۱۹؎اخبار الحکماء صفحہ ۱۳۰، حاشیہ مختصر الدول ۲۸۱

۲۰؎اخبار الحکماء صفحہ ۱۳۳

۲۱؎اخبار الحکماء ۱۳۳ تاریخ مختصر الدول صفحہ ۲۸۲

۲۲؎اخبار الحکماء ۱۳۳، تاریخ مختصر الدول، صفحہ ۲۵۹

۲۳؎اخبار الحکماء صفحہ ۱۳۳ تاریخ مختصر الدول صفحہ ۴۴

۲۴؎طبقات الاطباء۔اول صفحہ ۲۲۶

۲۵؎مختصر الدول صفحہ ۲۹۶

۲۶؎الفہرست ۳۰۲، اخبار الحکماء صفحہ ۷۸

۲۷؎طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۲۶

۲۸؎اخبار الحکماء صفحہ ۷۷

۲۹؎مختصر الدول صفحہ ۲۹۶

۳۰؎الفہرست صفحہ ۳۰۲

۳۱؎اخبار الحکماء صفحہ ۲۶۰

۳۲؎ اخبار الحکماء صفحہ ۲۶۰

۳۳؎اخبار الحکماء صفحہ ۲۷۹

۳۴؎اخبار الحکماء صفحہ ۲۷۹

۳۵؎اخبار الحکماء صفحہ ۲۵۹

۳۶؎طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۲۴

۳۷؎اخبار الحکماء صفحہ ۷۷

۳۸؎وفیات الاعیان جلد ا صفحہ ۲۱۶

۳۹؎سالا یونوس (اصیبعہ)

۴۰؎ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۱۶

۴۱ مختصر الدول صفحہ ۲۵۶

۴۲ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۱۱۸

۴۳ وفیات الاعیان جلد ا صفحہ ۲۷۸

۴۴ اخبار الحکماء صفحہ ۸۱

۴۵ میڈیکل ہسٹری آف پرشیا صفحہ ۱۳۴

۴۶ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۰۷

۴۷ الفہرست صفحہ ۲۵۱

۴۸ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۱۷

۴۹ اخبار الحکماء صفحہ ۸۵

۵۰ الفہرست صفحہ ۲۷۲

۵۱ طبقات الاطباء جلد ا صفحہ ۲۱۸، اخبار الحکماء صفحہ ۱۶۴

۵۲ الفہرست صفحہ ۲۷۲

۵۳ الفہرست صفحہ ۲۷۲

۵۴ الفہرست صفحہ ۲۹۰

۵۵ تاریخ الحکما صفحہ ۸۴

۵۶ طبقات الاطباء جلد اول صفحہ ۱۲۹

۵۷ چہار مقالہ صفحہ ۱۷۰، مطبع بریل لائڈ ۱۹۰۹ء

۵۸ "اطباء عہد مغلیہ" "تذکرہ خاندان عزیزی"، "دلی اور طب یونانی"

۵۹ رہا یعنی اڈیسہ URFA, EDESSE بین النہرین کا مشہور شہر تھا۔ اپنے علمی مراکز کی وجہ سے تیسری سے پانچویں صدی تک اس کی بڑی شہرت رہی۔ یہاں تک کہ ثقافت وادب اور طب کا مرکزی مقام بن گیا۔ عربوں نے اسے ۶۳۹ء میں فتح کیا۔

۶۰ علی گڑھ کے ان عربی پروفیسر کا نام یوسف ہارویز تھا، جو مشہور جرمن مستشرق تھے۔

۶۱ یہ واقعہ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء کا ہے۔ ۱۲۰۴ھ تک نجف قلی خاں کی تجارہ میں عملداری رہی۔ اسی سنہ میں اسماعیل خاں و غلام قادر روہیلہ نے اتفاق کر کے بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور قلعہ کو لوٹ کر تباہ کیا۔ مادھو راؤ سندھیا فوج لے کر بادشاہ کی مدد کو آیا اور اسماعیل خاں سے آشتی کر کے ملک مقبوضہ نجف خاں اس کو لکھ دیا۔ اسمٰعیل خاں ریواڑی آیا اور نجف قلی خاں سے سرگرم کارزار ہوا۔ کچھ عرصہ نجف قلی خاں محصور رہا۔ بالآخر کچھ ملک دے کر اسمٰعیل خاں سے صلح کرلی۔ مادھو راؤ سندھیا نے اسمٰعیل خاں کے تنبیہ کے واسطے فوج طلب کی۔ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں اس کی خبر پاکر اسمٰعیل خاں پابند فکر و تردد ہوا، فوج اسمٰعیل خاں میں ہلچل پڑ گئی۔ میر منوم صاحب (نمائندہ) اسمٰعیل خاں نے واسطے رفع شر فوج مرہٹہ کے چند اشخاص سے کہ منجملہ ان کے میاں یونس صاحب دادا میاں سلام اللہ صاحب بھی تھے یہ سیفی شروع کرائی۔ "انا اعطینک الکوثر فصل لربک وانحر فوج مرہٹہ ابتر ابتر ابتر،، مشیت ایزدی اسمٰعیل خاں کو شکست ہو گئی اور ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں تجارہ میں مرہٹوں کی عملداری ہو گئی۔ (ارزنگ تجارہ ص ۵۱)

۶۲ راقم الحروف کے حقیقی نانا قاضی خلیل الدین (متوفی شب جمعہ ۲۵ محرم ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۷ء) قاضی عبدالباقی کی آٹھویں پشت میں تھے سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ قاضی خلیل الدین ابن قاضی فیاض الدین ابن قاضی غلام محی الدین ابن قاضی نجیب الدین ابن قاضی محمد امان ابن قاضی محمد ماہ ابن قاضی بدر الدین ابن قاضی غلام محی الدین ابن قاضی عبدالباقی ابن قاضی محمد ابراہیم۔

قاضی عبدالباقی بہت صاحب اقتدار و ریاست تھے اور علم و فضل میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے ہی تجارہ میں باغات اور حویلیوں کی تعمیر کرائی اور محلہ کے عالیشان دروازے بنوائے۔ اپنے بیٹے قاضی غلام محی الدین کی شادی میں ہانڈی شیرینی تمام مضافات میوات میں تقسیم کی۔ اسی طرح اپنے والد قاضی محمد ابراہیم کی فاتحہ خوانی بھی نہایت اہتمام سے کی۔ قاضی محمد ابراہیم نے ۲۵ر محرم ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۵ء میں وفات پائی تھی۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے۔

چو قاضی ابراہیم شریعت پناہ — گزشتہ ز عالم خداوند ماہ
خرد گفت تاریخ فوتش بگو — الف واؤ عین از محرم بماہ

قاضی عبدالباقی شہنشاہ ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے حضور میں حاضر رہتے تھے۔ شہنشاہ ان کے علم و فضل سے بہت خوش تھا، اس نے ان کو مضافات تجارہ پر اختیار

دیا تھا کہ وہ جس کو اہل قرار پائیں اس کا عہدہ قضا پر تقرر کریں۔ ہمارے سامنے امتحان کی ضرورت نہیں ہے۔ عین جوانی میں ۳۰ جمادی الاول ۱۱۱۳ھ / ۱۷۰۱ء میں انتقال ہوا۔ قطعہ تاریخ وفات ہے

بزرگ زماں قاضی عصر بود　　زمیدان ایں گوئی نیکی ربود
زمرکش جہاں دیدہ پرخوں شدہ　　فلک دست افسوس بر سینہ بود
چو تاریخ فوتش بجستم زدل　　بگفتہ شنو گو خدا دوست بود

۶۳ حضرت شاہ غلام نبی کا ایک منظوم قلمی رسالہ "پندنامہ" جو میاں محمد شعیب کے خاندان سے متعلق دوسرے قلمی رسائل کے ساتھ مجلد ہے، راقم کو جد محترم کے ذخیرہ میں ملا ہے۔ اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔ "پندنامہ عشق انگیز کہ مناسب احوال زمرۂ عشاق است بفضل اخص شمع افروز بزم حسن و عشق کہ ہر دو مستنیر انوار خورشید حقیقت اند بتاریخ دوئم ربیع الثانی سنہ یک ہزار و یک صدی ونود ویک ہجری باتمام رسید من تصنیف خلیفہ غلام نبی ساکن ریواڑی کے مرد قابل بودند۔"

۶۴ میاں محمد رفیع ہزدہم ربیع الاول ۱۲۱۸ھ ازیں جہاں رحلت کردند و رخت ہستی از دار فانی بدار جاودانی بردند،

شد محمد رفیع ز دار فنا　　بود از خلق خوش چہ نیک سرشت
ہژ دہم بود از ربیع الاول　　روز جمعہ گزاشت عالم زشت
تاکہ بودش دریں خراب آباد　　از عملہائے خوب زرع بکشت
ہاتف از غیب ایں ندا دادہ　　جز عبادات حق کہ یافت بہشت

(از شجرہ میاں محمد یونس" مخطوطہ)

۶۵ نگارستان مسلمان میں میاں محمد شعیب" لکھتے ہیں۔ میر مسلمان بن عبدالغنی خان بن خواجہ عبدالرحیم خاں رحمتہ اللہ الغفران دہلی کے باشندوں میں عزت و حرمت میں مشہور اور صاحب مقدرت تھے۔ متصل درگاہ شاہ پیر اچوراہہ

پر سربازاوان کا مکان تھا۔ جس میں وہ سکونت فرماتے تھے۔ حضرت میر صاحب کے دادا شہنشاہ عالمگیر کے مقرب و معتمد تھے اور وقت مجرا وسلام حضور بادشاہ ان سے ہمکلامی فرماتے تھے۔ عالمگیرؒ نے ان کے انتقال پر ایک رقعہ میں اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ دیندار اور متقی تھے، بہادری و شجاعت میں مرتبہ کمال رکھتے تھے۔ عالمگیر نے ان کے لڑکوں کے حالات سے اپنے کو مطلع رکھنے کے لئے ہدایت کی ہے۔ اور عنایت اللہ خاں کے واسطے حکم دیا ہے کہ ان کے ہر لڑکے کے ساتھ رعایت کی جائے۔ "نگارستان مسلمان فارسی قلمی صفحہ ۳ رقعات عالمگیر مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۴ء رقعہ ۱۳۳ صفحہ ۴۹) حضرت میر صاحب کے والد عبدالغنی خاں کا انتقال ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء اور حضرت میر صاحب کا انتقال ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں ہوا ہے۔

۶۶ تجلیات مرشد صفحہ ۹۳، ۹۴

۶۷ یہ رسالہ حضرت میاں واحد علی شاہ کی حسب ہدایت حکیم سید کرم حسین نے شائع کرایا تھا۔ مطبع حیدر دہلی میں طبع ہوا ہے۔ سن طباعت درج نہیں ہے۔ حضرت پیر جی احمد شاہؒ کا ایک دیوان توحید و نعتیہ مضامین پر مشتمل تھا جو طبع نہیں ہو سکا۔ دیوان احمدی کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رامپور میں محفوظ ہے۔ سرور العاشقین اور پند غوثیہ بھی ان کی تصانیف میں ہیں۔

۶۸ حضرت سید محمد جمال شاہ (رامپور) حضرت نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب دہلی متوفی ۱۵، صفر ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء کے خلیفہ تھے۔

۶۹ مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی ۱۴۰۵-۱۳۰۸ء / ۸۰۸-۷۰۸ھ کچھوچھہ شریف کے شاہ علی حسینؒ سولہویں سجادہ نشیں تھے۔

۷۰ حضرت مولانا رکن الدینؒ حضرت مفتی مسعود احمد کے خلیفہ تھے اور حضرت مفتی مسعود احمد حضرت امام علی کے اجل خلفاء میں تھے۔ یہ حضرت امام علیؒ ایک دوسرے واسطے سے (حضرت عادل شاہؒ) حکیم کرم حسین کے والد قاضی سید امداد علی

کے بھی دادا پیر ہیں۔ مولانا مفتی مظہر اللہ متوفی ۲۸ر نومبر ۱۹۶۶ء امام مسجد فتح پوری دہلی حضرت صادق علی ابن حضرت امام علیؒ کے مرید تھے۔ لیکن انہیں خلافت اپنے دادا مفتی مسعود احمد کے خلیفہ مولانا رکن الدینؒ سے ملی تھی۔ مولانا رکن الدین کی تصانیف میں رکن دین بہت مشہور کتاب ہے جو ۱۳۰۵ھ/۱۹۳۱ء میں چودھویں بار دس ہزار کی تعداد میں اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی سے طبع ہوئی ہے۔ دوسرے مطابع اور اس سنہ کے بعد کی اشاعتوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ ان کی دوسری تصانیف میں توضیح العقائد، مولود محمود، رسالہ طاعون، اربعین اور روح الصلوۃ ہیں۔ صاحبزادہ مولانا حکیم محمد محمود مفتی ریاست الور نے مصباح السالکین فی احوال رکن الملت والدین کے نام سے سوانح شائع کی ہے۔ مولانا رکن الدینؒ کا مزار داؤد پور الور میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔

۱ے میاں محمود لعل شاہؒ حضرت مدنی شاہؒ کے خلیفہ تھے جن کا شمار حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کے اکابر خلفاء میں تھا، حکیم کرم حسین کی ہمشیرہ انوری بیگمؒ میاں محبوب لعل شاہؒ کی مرید تھیں۔ حضرت مدنی شاہؒ کا انتقال ۲۸ر رجب ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء کو الور میں ہوا۔ ان کے ایک خلیفہ سید اعجاز حسین شاہ نے ایک رسالہ مجموعہ رسائل رحمانی کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس میں نور رحمانی، لطف رحمانی اور انوار رحمانی تین رسالے شامل ہیں۔ مطبع نامی کانپور محمد رحمت اللہ میں ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء میں طبع ہوا ہے۔ یہ رسائل حضرت مدنی شاہ کی تعلیمات ملفوظات اور حالات پر مشتمل ہیں۔ ان کی دوسری کتاب منشور حقائق الاسرار بھی ہے۔

۲ے بڑے اچھے بزرگ تھے۔ جھالر اپاٹن (کوٹہ راجستھان) میں آپ کا مزار ہے۔

۳ے خواجہ محمد کمال الدین المعروف میاں کلن شاہؒ متوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۳ء قطب وقت حضرت میاں مراد شاہؒ متوفی ۱۱ر رجب ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء (ارزنگ تجارہ صفحہ ۴۵) کے آٹھویں سجادہ نشین تھے۔ میاں مراد شاہؒ کے پہلے جانشین میاں دائم شاہ نے

۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں وفات پائی۔ رفتہ بمراد دائم باروح تاریخ رحلت ہے۔ حضرت میاں مراد شاہ کی درگاہ حسن پور تجارہ میں مرجع خلائق ہے۔ یہ عالی شان درگاہ مہاراجہ بھرتپور کی بنوائی ہوئی ہے۔ ۱۰اور ۱۱رجب کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی نے معافی میں تین موضع نذر و وقف کئے تھے۔ آپ مداریہ خاندان کے بزرگ تھے جن کا سلسلہ قطب المدار حضرت سید بدیع الدینؒ متوفی ۸۳۸ھ / ۱۴۳۴ء مکن پور ضلع کانپور سے شروع ہوتا ہے۔ سید علی شکوہ کی ایک تصنیف "قطب المدار مرقع درگاہ شریف" کے نام سے حسب فرمائش حافظ عبدالحلیم رئیس کانپور و حکیم سید کرم حسین ۱۳۴۳ء / ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ حکیم کرم حسین کے منجھلے بھانجے حکیم محمد مبین احمد متوفی ۱۸ر ستمبر ۱۹۶۳ء میاں کلن شاہؒ سے بیعت تھے اور ان کے مقرب مریدوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حسن پور بارہ میں عرس کے موقع پر سجادہ نشین کی مسند کے برابر مین حکیم کرم حسین کی نشست کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ان کے قیام کے لئے مخصوص جگہ مقرر تھی اور حضرت میاں کلن شاہؒ اور ان کے جانشین حکیم صاحب کا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔